اورنگزیب یوسفزئی جنوری ۲۰۱۷

قرآن کی تفسیر نویسی کا گناہِ عظیم

جرم کی ابتدا، اسبابِ جرم اور نتائج و عواقب

زیرِ نظر کتاب تین حصوں میں اہلِ نظر کے مطالعے کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تین حصے درجِ ذیل عنوانات کے حامل ہیں:-

۱] تحقیقِ تفاسیر قرآنی۔ تفسیر نویسی ایک فن یا حدود فراموشی کا جرم؟

۲] تفسیر نویسی کی لایعنیت

۳] قرآن فہمی اور عربی زبان۔ ہماری منطقِ قیاسی کی بنیاد پر لکھی گئی تفاسیر کی روشنی میں

حصہ اول: تحقیقِ تفاسیر قرآنی

تفسیر نویسی ایک فن یا حدود فراموشی کا جرم؟

مسلم تہذیب میں قرآنی تفاسیر و تشریحات لکھنے کا گناہِ عظیم

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

موضوعِ زیرِ تحقیق دراصل قرآنی تفاسیر نویسی کا وہ ہمہ وقت جاری طولانی سلسلہ ہے جو ایک جنون کی سرحدوں تک رسائی حاصل کر چکا ہے، اور جس کی کوئی حد و نہایت یا نکتہِ اختتام مستقبل قریب میں متوقع نہیں ہے۔ اس جنونِ مسلسل کا واحد سبب یہ حقیقت ہے کہ فراموش شدہ دینِ الٰہی کی بازیافت سے اسلامی دنیا کی کسی بھی حکومتِ وقت کو قطعا کوئی دلچسپی نہیں۔ پس دانشور طبقے کو مصروف رکھنے اور عوام کو باہمی سر پھٹول میں منہمک رکھنے کے لیے ہماری مردہ یا منجمد اسلامی تہذیب میں اس میدان میں بلا روک ٹوک طبع آزمائی کی ہر ہما شما کو کھلی اجازت دے دی گئی ہے۔ تاہم اس کے سبب اسلامی تہذیب پر مرتب ہونے والے گھمبیر مسائل پر آج تک ذرہ برابر بھی سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی گئی۔ "نوبت بایں جا رسید" ، کہ ہر نیا تفسیر نویس اپنے تئیں بزعم خود اسلام کا واحد نجات دہندہ باور کرتا ہے اور اس بنا پر سابق سے موجود تمام تر تفاسیر کو مشکوک اور ضعیف گردانتے ہوئے اپنی تفسیر پر کمالِ کشف و اکتشاف اور انتہائے علم و خبر کا گمان رکھتا ہے۔ یہ سوچنے کی زحمت ہرگز گوارا نہیں کرتا کہ تفاسیر کے ایک کوہِ گراں کے بوجھ کے نیچے پہلے ہی دبی ہوئی مخلوق ایک مزید نئی تفسیر کے مطالعے کا ناگوار بوجھ برداشت کرنے کے لیے مطلوبہ وقت اور توانائی کہاں سے حاصل کر پائے گی!!!

البتہ ہر نئی تفسیر کا ایک طائرانہ جائزہ جو نتائج سامنے لاتا ہے ان کا نتیجہ "وہی ڈھاک کے تین پات" کی صورت بر آمد ہوتا ہے۔ ژولیدہ فکری، اکابر پرستی، التباس و اشتباہ، استخراجی منطق، لایعنی عبادات و رسومات اور ثواب و انعامات کے مبالغہ آمیز سلسلے کا ایک نیا باب مسلمان کی مایوس و نامراد زندگی میں مزید زہر گھولنے کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔

امّتِ مسلمہِ مرحومہ پر مسلط اس المناک اور احمقانہ صورتِ حال کے قطعا بر عکس، قرآنِ حکیم میں متکلم کی ذاتِ عالی شان کی جانب سے مسئلہ زیرِ بحث سے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے وہ ایک فرمان کی صورت نہایت صراحت کے ساتھ کچھ اس طرح صادر فرمایا گیا ہے:-

القرآن:25/33 - وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا -

(ترجمہ: اور یہ سب لوگ مل کر بھی تمہارے پاس اُس کی مثل نہ لا سکیں گے جیسا کہ ہم نے اکتشافِ حقیقت کے ساتھ اور **" خوبصورت ترین تفسیر کے ساتھ "** تم کو عطا کر دیا ہے۔)

فلہذا، کلامِ الٰہی کی اس "نصِّ صریح" پر تدبر و تفقہ کا عمل سر انجام دیتے ہوئے، اور اسی کی متابعت میں، اِس مقالے کو ہم اُس دیرینہ اور ہمیشہ در پیش سوال کے ساتھ شروع کرتے ہیں جس کی جانب مسلم تاریخ کے طویل عہد کے دوران کسی بھی نمایاں اور موقر مسلم سکالر یا ادارے نے - - - یا کسی بھی مسلم کہلانے والی حکومت نے - - - کبھی توجہ مبذول نہیں فرمائی!!!۔ کلامِ الٰہی کی روشنی میں، وہ دیرینہ سوال کچھ اس طرح ہمارے سامنے آتا ہے:-

کیا "تفسیر" لکھنے کی آڑ میں قرآن کے متن کے ساتھ انسانی الفاظ و خیالات کا ایک کثیر ذخیرہ شامل کرنا اور اس بہانے قرآن کے ساتھ گستاخانہ دست درازی (profane manipulation) کرنا جائز و حلال ہے یا ناجائز و حرام؟؟؟

(یہاں تفسیر سے مراد وہ تمام الفاظ ہیں جو اس ضمن میں انگریزی زبان میں بھی زیرِ استعمال ہیں، مثلاً " ,exposition, exegesis interpretation, explanation وغیرہ۔)

سوال کی بنیاد (origin) :

اس اہم سوال کی بنیاد اس آفاقی حقیقت پر مبنی ہے کہ کسی بھی تحریر کی درست اور حتمی تشریح و تفسیر اُس تحریر کے مصنف کے علاوہ دیگر کوئی بھی انسان نہیں جان سکتا۔ لہذا اپنی تحریر کے مافی الضمیر کو، اگر مزید تشریح کی ضرورت در پیش ہو، تو کوئی مصنف ہی بیان کرنے کی اہلیت و استعداد رکھتا ہے - - کیونکہ وہی جانتا ہے کہ اُس کے ذہن کی عمیق گہرائیوں میں کیا افکار کروٹیں لے رہے ہیں اور وہ اپنی تحریر کے ذریعے کس اصول، ضابطے، نظریے اور فلسفے کا اظہار کرنا چاہتا ہے، اور کس پیرائے میں!!!

قرآن کا معاملہ اس سے بھی سوا ہے۔۔۔ کیونکہ قرآن تو انسانیت کے اور اس عظیم کائنات کے نادر الوجود خالق کا کلام ہے، جس کی ہستی "برتر از خیال و قیاس و وہم و گمان است" کے مصداق ہے۔ ایک انسان کے مافی الضمیر تک تو دوسرا انسان، اگر ممکن ہو تو باہمی تبادلہِ خیالات کے واسطے

سے، کسی حد تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن یہ امر انسان کے مقام سے از حد بعید ہے اور مکمل طور پر خارج از امکان قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے عظیم خالق کے مافی الضمیر اور اس کے پس پردہ تخیل (underlying concept) کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکے۔ سوائے اس کے کہ جو کچھ خالق از خود ہی اپنے کلام یا تحریر کے الفاظ کے ذریعے ظاہر کر دے۔

نیز اگر صحیفے کا نزول انسان کی اپنی زبان میں وقوع پذیر نہ ہوا ہو تو انسان کا فریضہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس کے الفاظ کے ساتھ من و عن پیوستہ رہتے ہوئے اُن کی روح کو، معاملے کے سیاق و سباق کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتے ہوئے، زبان دانی کے اصول مدّ نظر رکھتے ہوئے، متعلقہ زبان کی مستند لغات کے ذریعے سے سمجھ لے یا ایک انتہائی محتاط ترجمہ کرتے ہوئے اپنی زبان میں منتقل کر لے۔ اور بس۔۔۔ "باقی ہَوس" !

تفسیر نویسی کیوں، کب، اور کس کے ہاتھوں شروع کروائی گئی؟

تفسیر نویسی آخر کیوں؟:-

یہاں ہمیں درپیش دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن کے عربی زبان میں نزول کی صورت میں، جب کہ اہلِ عرب اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت اور اس کے الفاظ کے معنی کی عظیم وسعت سے بخوبی واقف تھے، وہ کیا خفیہ مقاصد تھے جن کے تحت خود اہلِ زبان نے کلامِ الٰہی کو بخوبی سمجھتے ہوئے بھی اس کی تفاسیر لکھنے کا منصوبہ وضع کیا؟؟

ظاہر ہے کہ اہلِ عرب کو عربی تفاسیر کی کیا ضرورت تھی،،، جب کہ آیت 26/195 میں متکلم کی ذاتِ عالی نے خود فرمایا،،،، کہ یہ کتاب واضح اور صاف عربی زبان میں (بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ) نازل کی گئی ہے؟؟؟ (یہاں ہم غیر تعلیم یافتہ انسانوں، اہلِ ہنر، دستکار، کسان، مزدور وغیرہ جیسے ان مخصوص طبقات کا ذکر نہیں کرتے جو نہ قرآن پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی تفاسیر۔)

تو پھر ہر امیدوار کو کھلی اجازت کیسے عطا کر دی گئی کہ وہ جیسے چاہے تفسیر مرتب کرنے کے نام پر قرآن کے الفاظ و معانی میں اپنی جانب سے اپنے خیالات کا بے محابہ اضافہ کرتا رہے۔۔۔ اور یہ عمل اس حد تک نامعقولیت کی شکل اختیار کر لے کہ قرآن کی ایک واحد جلد کے مقابلے میں اس سے بدرجہا ضخیم تیس تیس جلدیں قرآن کی تشریح و تفسیر کی شکل میں وجود میں آ جائیں؟؟؟ گویا جس قدر بھی دیومالائی کہانیوں کا مواد قدیم صحائف و طلسمات کے حوالوں سے آپ تک پہنچا ہو، اُس سب کو بلا امتیازِ معیار و حجم قرآن کی تشریح کے عمل میں اصل مفہوم کا حصہ بنا دیا جائے! نیز ایسے طوالانی مواد کا پڑھ جانا ہی اگر خارج از امکان ہو جاتا ہو، تو ہوتا پھرے!

جب کہ قرآن کے متن میں۔۔۔ اور اِسی کی مانند اُس متن کے الفاظ کے لغوی معانی میں۔۔۔ ایک لفظ کا اضافہ، یا ترمیم و تصحیح بھی، قرآن میں تحریف کے جرم کا ارتکاب ہے؟

ہم اس مرحلے پر ایک مفسر کی اہلیت یا عدم اہلیت کا تو سوال ہی نہیں اُٹھاتے۔ ہم اُس کے اِس میدان میں حاصل کردہ متعلقہ علوم یا قابلیت کے متعلق بھی استفسار نہیں کرتے۔ ہم یہاں یہ بھی تجزیہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے کہ ان تمام اصحاب کی تفاسیر میں نزولِ قرآن کے زمانے کی ملکی جدوجہد، تاریخی پسِ منظر، معروضی معاشرتی حقیقت، ما قبل سے موجود طبقاتی جبر و استحصال، قوانینِ فطرت، اصنافِ علوم اور ذاتِ انسانی کے مطالعے کو پیشِ نظر کیوں نہیں رکھا گیا۔ یہ سب بڑے موضوعات ہیں اور علیحدہ علیحدہ تحقیق کے طالب۔ اس مقالے میں ہماری توجہ کا مرکزی نقطہ تو یہ بنیادی اصول یا قانون ہے کہ صرف اور صرف قرآن کا متکلم ہی وہ قابلیت، وہ اہلیت اور وہ استعداد رکھتا ہے کہ اپنی کتاب کی تشریح کر سکے۔ قرآن صرف اُس ذاتِ پاک ہی کے اعلیٰ ذہن کی پیداوار ہے۔ صرف وہ ذاتِ پاک ہی جان سکتا ہے کہ وہ کیا ابلاغ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور کیا تعلیم انسانیت کو بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے کیسا پیرایہ بیان ضروری تھا، اور کون سے الفاظ و اصطلاحات و محاورات و تشبیہات استعمال کرنا مناسب ترین اور قرینِ عقل تھا۔

اور،،، آخر میں یہ آنکھیں کھول دینے والی حقیقت کہ،،،، وہ ذاتِ پاک بار بار اپنی کتاب میں اس امر پر زور دیتا ہے کہ وہ اسے پہلے ہی سے مکمل طور پر، باریک ترین تفصیل کے ساتھ، بغیر کچھ بھی نظر انداز کیے، کھول کر بیان کر چکا ہے!!!۔۔۔ تو پھر انسانی زبان و بیان میں اس کا مزید بیان-- - چہ معنی دارد؟؟؟۔۔۔۔ تحقیق کرنے پر آپ کو اس دراندازی کے حق میں ذرہ برابر بھی توجیہ یا جواز یا سبب نہ مل پائے گا!

لہذا، ہم یہ بات بآسانی کہ سکتے ہیں کہ اُس ذاتِ پاک کی غیر متزلزل اور ثقہ ترین شہادت کے مطابق، کسی بھی مزید تفسیر کی نہ ضرورت تھی اور نہ ہی قرآن کی تشریح و تفسیر کے لیے کسی بھی انسانی مداخلت کی اجازت تھی اور نہ کسی انسان میں اس کی اہلیت۔

جرم کے اسباب اور پسِ منظر

انتہائی قرینِ عقل امکان یہی ہے کہ تفسیر نویسی کا عمل دراصل قرآن میں ملاوٹ کرنے اور اس الہامی صحیفے کے سچے معانی تبدیل کر دینے کا ایجنڈا رکھتا تھا۔ اس لیے کہ۔۔۔۔ تفسیر لکھنا صرف ایک ہی مذموم مقصد رکھ سکتا تھا۔۔۔۔ کہ۔۔۔ اس دینِ حق پر مبنی کتاب کو انسانی خیالات سے آلودہ کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیا جائے تا کہ ایک دو نمبر کا بناوٹی اسلام ایجاد کرتے ہوئے، اپنی من مرضی کے مذہب کی آڑ یا آسرا لے کر، اپنے ناجائز سیاسی غلبے کو جائز قرار دیا جائے اور اپنے مذموم استحصالی مقاصد کو بروئے کار لایا جا سکے۔

اسی مذموم مقصد کے تحت تفاسیر کی اصل و بنیاد ہی تفسیری روایتوں اور شانِ نزول کے طول طویل مفروضات اور دیومالائی افسانوں پر رکھی گئی۔

یہ بدعت کب شروع کی گئی؟

نہایت قابلِ غور امر یہ ہے کہ حضور رسالتمآب ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں، اور خلافتِ راشدہ کے لگ بھگ ۲۸ سالہ دورانیے میں کسی تفسیر و تشریح کا وجود ہی ثابت نہیں۔ اُس اولین دور کے ذمہ داران اور وقت کے اولی الباب اپنی فصیح و بلیغ زبان خوب سمجھتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک عام عرب بھی بلکہ ایک بدو بھی، دیگر اہلِ زبان سے بالکل جدا، اپنی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کی خصوصیت کے لیے، بقول مختلف سکالرز، ایک خاص اور مسلّمہ شناخت رکھتا تھا۔ حضرت عمرِ فاروق، خلیفہِ راشد دوم، کے لیے تواریخ شہادت دیتی ہیں کہ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں قرآنِ کریم کے کئی لاکھ نسخے نقل کروا کر مملکتِ اسلامیہ کے کونے کونے میں ارسال کروا دیے تھے۔ قرونِ اولیٰ، یا قرونِ مشہود لہا بالخیر کے اُس بابرکت دور میں ایسا کیوں نہ ہوا کہ قرآن کی تفہیم کے لیے اس کی نقول کی بجائے تفسیریں تیار کروائی جاتیں اور انہیں پوری مملکت میں پھیلایا جاتا؟

قرین قیاس یہی ہے کہ دورِ خلافتِ راشدہ میں ایسا کوئی فتنہ ابھی نمودار نہیں ہوا تھا جو قرآن کے سچے معانی تبدیل کر دینے کا ایجنڈا رکھتا ہو۔ نہ ہی اُس وقت تک تفسیری روایتوں کی ایجاد اور شانِ نزول کی کہانیوں کی اختراع پیدا کی گئی تھی۔ فلہٰذا کسی نوع کی تفسیر کی ضرورت ہی درپیش نہ تھی۔ قرآن اپنی خود تصریحی اور خود مکتفی حیثیت میں قائم و دائم تھا۔ اور اپنے عطا کردہ نظریے کے معاشرے پر عملی اطلاق کے دور سے گذر رہا تھا۔

مسلم تہذیب میں اولین تفسیر لکھنے کا کام جس شخصیت نے انجام دیا اس کا تاریخِ وفات 146 سنِ ہجری ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام دوسری صدی ہجری میں اموی دور کے اواخر (132 ہجری) سے کافی قبل ہی شروع کروا دیا گیا تھا۔ یہ کام اُسی دور میں اور بعد ازاں عباسی دور میں جاری رکھا گیا۔ یہ وہی دور تھا جب انقلابِ معکوس برپا کر کے خلافت راشدہ کا خاتمہ کیا جا چکا تھا۔ اور حقیقی اسلام کے دشمن اموی سلاطین 40 ہجری کے بعد اقتدار پر اپنا جبری قبضہ مکمل و مضبوط کرنے کے بعد ایک غیر قرآنی موروثی استحصالی بادشاہت کا سلسلہ قائم کر چکے تھے۔ سابقہ حقیقی اسلامی ریاست کے ہیڈ کوارٹر مدینۃ النبی اور بعد ازاں حضرت عبد اللہ ابنِ زبیر کے دارالحکومت شہر مکہ پر حملے اور قتلِ عام کے ذریعے حقیقی اسلام کی تمام نشانیاں اور آثار و باقیات، اور اس کی نام لیوا جُملہ شخصیات کو ہمیشہ کے لیے صفحہِ ہستی سے مٹا چکے تھے۔ عرب کے چپے چپے پر پھیلے مقامی یہودی علماء کی خدمات حاصل کی جا چکی تھیں اور ان کی مدد سے مملکت کے طول و عرض میں فتنہِ وضعِ حدیث کے ذریعے قرآنی تعلیمات کو مسخ کرنے کی مہم زور شور کے ساتھ جاری تھی۔

یہ بدعت کس کے ہاتھوں شروع کروائی گئی؟

اسلامی تاریخ کی اولین تفسیر لکھنے کے جرم کا جس شخصیت نے ارتکاب کیا اس کا نام نامی محمد بن السائب، المعروف کلبی (المتوفی 146ھ) تھا۔ مذکورہ شخصیت، اپنے دور کے مشہور مؤرخ، ماہرِ انساب اور مسلمہ تفسیر کے امام تصور کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تفسیری کہانیوں سے کوئی بھی متاخر تفسیر خالی نہیں۔ ان کی تفسیر تفسیر ابنِ عباس کے نام سے موسوم ہے اور آج بھی بازار میں دستیاب ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے یہ تمام تفسیر ابو صالح سے سنی ہے، اور ابو صالح نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے۔ اسی لیے یہ دو ناموں سے مشہور ہوئی، یعنی تفسیر ابن عباس، اور تفسیرِ کلبی۔ آیئے

دیکھتے ہیں کہ جدید دور کے عظیم ترین محقق علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی کے مطابق، عالمِ اسلام کے یہ پہلے " جلیل القدر مفسر " کس کردار کے مالک تھے، اور اس قماش کے کردار کے حامل کو کون تخریب کار اور غارت گرِ دین وایماں اس کارِلائقہ کی ذمہ داری تفویض کرسکتا تھا۔

نام: محمد بن السائب۔ کنیت: ابوالنفر۔ خاندان: بنوکلب۔ کوفہ کا باشندہ ہے۔ ماہرِ انساب، مفسر اور مؤرخ ہے۔ امام شعبی وغیرہ سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے اس کا بیٹا ہشام اور ابومعاویہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ اس کی روایت جامع ترمذی میں پائی جاتی ہے۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں، کلبی خود کہا کرتا تھا کہ مجھ سے ابوصالح نے ایک بار بطورِ نصیحت یہ بات فرمائی تھی کہ اے کلبی،، تُونے ابنِ عباس کی جتنی روایات مجھ سے سنی ہیں انہیں کسی سے بیان نہ کرنا۔ (پھر بھی اس بے حیاء نے سب کچھ بیان کر دیا اور پوری ایک کتاب لکھ ڈالی۔)

ابومعاویہ کہتے ہیں، میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا ہے کہ جتنی جلد میں نے قرآن حفظ کیا ہے اُتنی جلد کسی نے قرآن حفظ نہیں کیا۔ میں نے صرف چھ یا سات دن میں قرآن حفظ کرلیا تھا۔ اور جس طرح مجھے بھول واقع ہوئی ہے ایسی بھول بھی کسی کو واقع نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ اس طرح کہ میں نے اپنی داڑھی مٹھی میں لی تاکہ داڑھی نیچے سے کاٹ کر برابر کروں، اور اُوپر سے کاٹ دی۔

امام یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ مجھ سے خود کلبی نے یہ بیان کیا کہ میں نے جس شے کو ایک بار یاد کرلیا، کبھی بھولا نہیں۔ لیکن ایک بار میں نے حجام کو بلوایا اور اپنی داڑھی برابر کرانے کے لیے مُٹھی میں لی، اور بجائے نیچے سے کٹوانے کے اوپر سے کٹوالی۔ (یعنی ایک بار خود کاٹی اور ایک بار حجام سے کٹوائی۔ کذب بیانی کی عادتِ قبیحہ کا اندازہ کیجئے)

یعلی بن عبید کہتے ہیں کہ امام سفیان ثوری نے لوگوں سے فرمایا کہ اے لوگو، اس کلبی کی روایتوں سے بچو۔ کسی نے ان سے عرض کیا، آپ بھی تو اس کی روایات نقل کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا میں تو اس کے سچ اور جھوٹ کو پہچانتا ہوں۔ یعنی یہ جانتا ہوں کہ اس کی کون سی روایت درست ہے اور کون سی غلط۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمان بن مہدی نے اس کی روایت ترک کی ہے۔ پھر امام بخاری نے امام سفیان ثوری کا یہ قول باسند نقل کیا کہ مجھ سے خود کلبی نے یہ بات کہی تھی کہ میں تجھ سے ابوصالح کے واسطے سے جو بھی حدیث بیان کروں تو سمجھ لے کہ وہ خالص جھوٹ ہے۔

یعلی کا بیان ہے کہ میں اس کلبی سے قرآن پڑھنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن بولا کہ میں ایک دفعہ شدید بیمار ہوا اور اس بیماری کے باعث سب کچھ بھول گیا۔ میں آلِ محمد کی خدمت میں گیا۔ انہوں نے میرے منہ میں تھوکا، تو مجھے سب کچھ بھولا ہوا یاد آگیا۔ نامعلوم آلِ محمد میں سے کتنے افراد سے اس نے اپنے منہ میں تُھکوایا ہوگا۔

امام یحیٰ بن معین کا قول ہے کہ کلبی ثقہ نہیں ہے۔ دار قطنی اور ایک جماعت کہتے ہیں کہ متروک ہے۔ جوز جانی وغیرہ کہتے ہیں، یہ کذاب ہے۔ امام ابنِ حبان فرماتے ہیں اس کا مذہب بھی ظاہر ہے اور اس کا جھوٹ بھی اتنا اظہر من الشمس ہے کہ محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ ابو صالح کے واسطے سے ابن عباس سے تفسیر نقل کرتا ہے، حالانکہ ابو صالح نے ابن عباس کو دیکھا تک نہیں۔ اور اس نے ابو صالح سے صرف ایک دو ہی باتیں سنی تھیں۔ اب جب بھی اسے جھوٹ بولنا ہوتا ہے تو اس ابو صالح کو یہ زمین کی گہرائیوں اور تاریکیوں سے باہر نکال لاتا ہے۔ اس کا اور اس کی روایت کا کسی کتاب میں ذکر کرنا بھی حلال نہیں— کجا کہ اس کی روایت کو بطور دلیل پیش کیا جائے (میزان الاعتدال)۔

عزیز قارئین، یہ تھی انتہائی مذموم ابتدا قرآنی تفاسیر لکھنے کے مجرمانہ عمل کی!!! اُس مسلّمہ بدکردار انسان کے انتہائی سازشی خیالات و الفاظ پر مبنی اِس تفسیری شاہکار کی بازگشت آپ کو بعد ازاں نمودار ہونے والی ہر تفسیر میں بدرجہ اتم موجود ملے گی۔ نیز امام طبری کی تیس جلدوں پر مبنی "ام التفاسیر" سے لے کر آج کے دن تک لکھی جانیوالی تمام تفاسیر میں بھی۔ ظاہر ہے کہ مطلق العنان اموی دور اور بعد ازاں عباسی خلفاء کے ابتدائی دور میں جہاں معاشرے کو جبر و استبداد کے شکنجے میں جکڑ لیا گیا تھا،،، تاریخ کا ایک ایسا مشتبہ و منفی کردار قرآن کی اولین تفسیر لکھنے کا کام تب ہی کر سکتا تھا جب اسے باقاعدہ منصوبے کے تحت چنا گیا ہو،،، حکومتی سرپرستی حاصل ہو، اور باقاعدہ ایک متعین شدہ ایجنڈے پر کام کر رہا ہو۔

کیونکہ وہ خاص دور اموی سلاطین کی منصوبہ بندی اور سرپرستی کے تحت، مسلمانوں کے بھیس میں سرگرم عمل مقامی عرب یہودی علماء کی بالادستی کا دور تھا، جن کو حقیقی اسلام کی بربادی کا مشن تفویض کیا گیا تھا، اس لیے یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ کہ کلبی ایک چھپا ہوا یہودی عالم ہو۔ اس کا تفسیرِ ابن عباس لکھنے کا کارنامہ اور اس عمل کے پیچھے پوشیدہ کاریگری جسے اوپر سندات کے ساتھ بیان کیا گیا، اس امکان کو پوری تقویت بخشتا ہے۔

بعد ازاں آنیوالی تمام تفاسیر کی امام قرار دی جانیوالی "ام التفاسیر" بھی، جس کا مرتب کردہ مواد آج تک کی لکھی گئی تمام تفاسیر میں موجود رہا ہے، ایک ایسی ہی مشتبہ کردار کی حامل شخصیت، یعنی امام کہلانے والے محمد بن جریر بن رستم طبری (المتوفی 310 ہجری) کے ہاتھوں لکھی گئی۔ اس شخصیت کے بارے میں تحقیق و تفتیش کے کام کا بیڑا اجنابِ مرحوم و مغفور حضرت علامہ تمنا عمادی نے اُٹھایا اور اس مہم کو بحسن و خوبی اپنی کتاب "امام زُہری اور امام طبری— تصویر کا دوسرا رُخ" میں قلمبند کیا۔ قارئین یہ چشم کشا تحریر مذکورہ کتاب میں مطالعہ کر سکتے ہیں جو اس مشتبہ منفی کردار کے حامل کے بارے میں بہت سے انکشافات پر مشتمل ہے۔

یہاں سے کچھ اور بھی اہم ضمنی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

درجِ بالا تمام حقائق کے پیشِ نظر، انسانوں میں وہ کون لوگ ہیں جو پھر بھی یہ جرات کر سکتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر یا تشریح کرنے کی مہم پر کام کریں؟؟؟ سوائے اللہ کی حکم عدولی کرنے والوں کا ایک مجرم گروہ جو نسل در نسل پیدا ہوتا آیا ہے، کوئی بھی معتبر اور قرآن کی حقیقت کو بخوبی جاننے والا محقق، یہ کام کرنے کی جرات نہیں کر سکتا،،،، کیونکہ،،،،، اللہ تبارک و تعالیٰ بذاتِ خود یہ قطعی اور حتمی اعلان فرماتے ہیں کہ ان کی یہ کتاب

انسانیت کو ایک انتہائی مفصل اور واضح طور پر بیان کردہ حالت میں دی گئی ہے ؟؟؟ جبکہ اللہ تعالیٰ یہ بھی اعلانِ عام کر چکے ہیں کہ کوئی بھی خود ذاتِ باری تعالیٰ سے بہتر انداز میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔

وہ کون لوگ ہیں جو باری تعالیٰ کا بطورِ مصنف اور ترجمانِ قرآن ایک اعلیٰ مقام اور اس مقام کی بلند حدود کو پار کرنے کی جرات کرتے ہیں ؟؟؟ یہ وہی غافل اور نام نہاد " علماء " ہیں جو مجرمانہ طور پر یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ان کا درجہ باری تعالیٰ سے بھی بلند و بالا ہے، اور سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کا کلام ایک بار پھر سے، اپنے بے مایہ الفاظ میں، اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ نمایاں انداز میں بیان کر سکتے ہیں !!! استغفر اللہ !

اس مذموم عمل کے اسلام کی بنیادوں پر تباہ کن اثرات

یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تفاسیر لکھنے کے اس قبیح "فنِ کتابت" کی ترویج ہی کے باعث ہم مسلمانوں پر ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اور دماغ ماؤف کر دینے والا مقدس تفاسیر کا مجموعہ متقدمین کی مہربانیوں کے باعث نازل ہو چکا ہے جن کی ایک ایک کاوش تین اور سات سے لے کر تیس تیس اور اس سے بھی زیادہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں پڑھتے پڑھتے عمریں گذر جائیں تو بھی مطالعہ کا مکمل ہونا ایک خواب ہی رہ جائے۔ ان قدیمی فاضلین میں سے تقریباً تمام کے تمام اغلباً" مسلم دنیا کی سامراجی حکومتوں کے کاسہ لیس اور وظیفہ خوار تھے کیونکہ ان کی تحریر پر نہ کوئی سنسر تھا اور نہ کوئی ڈبل چیک۔ تاہم ہم عصر نابغہ شخصیات بھی اس توہینِ تقدیسِ الٰہی کی مہم میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ انہوں نے بھی کامیابی کے ساتھ متقدمین کا مقابلہ کیا اور فضولیات کے اس خوفزدہ کرنے والے احمقانہ پلندوں کے ڈھیر میں اپنے ذاتی خیالات و الفاظ کے مزید کئی پلندوں کا اضافہ کر دیا۔

یہ بات ہم سب پر اچھی طرح واضح ہے کہ اموی ڈکٹیٹروں اور دیگر مطلق العنان حکومتوں کے زیر سرپرستی وضع کردہ ملوکیتی اسلام نے فتنۂ وضعِ روایات کے ذریعے اور انہی روایات پر اپنی اساس رکھنے والی قرآنی تفسیروں کے ذریعے مسلمانوں کے لیے ایک ایسی وراثت چھوڑی ہے جو توہمات، تفریق باہمی، دھوکا دہی، شرم و ندامت اور خوف و دہشت پر مبنی ہے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ جب بھی ہم لوگ قرآن کا ترجمہ اپنی اردو زبان میں کرتے ہیں تو دراصل ہم متوارث چلی آرہی تفاسیر کی انہی خرافات کو اپنے تراجم میں شامل کر لینے کا عمل سرانجام دیتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں قرآن کا اصل پیغام اور اس کا الہامی نظریہ حیات نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ یہ انتہائی اہمیت کا حامل کام ہم ہرگز قرآنی متن کی مطابقت اور اسی کی روشنی میں انجام نہیں دیتے۔۔ نہ ہی ہم اس کے عظیم الشان ذخیرہِ الفاظ پر غور کرتے ہیں۔۔۔ نہ ہی اس کے بلند علمی اور ادبی اسلوب پر غور کرتے ہیں۔۔۔ اور نہ ہی اس کے بنیادی معاشرتی پیغام اور انقلابی

معاشی نظریے پر توجہ دیتے ہیں۔ انہی قدیم وجدید تفاسیر کے لازمی اطلاق کی پالیسی سے ہم نے یہ سیکھا ہے کہ قرآن کے عربی الفاظ کا صرف ایک واحد اردو معنی ہوتا ہے – – – خواہ اس واحد معنی کا قرآن کے ہر مقام پر مناسب اطلاق بھی نہ ہو سکے، اور خواہ اس واحد معنی سے قرآن کے پیغام کی روح کچل دی گئی ہو اور اس کو ایک غیر منطقی، جادوئی، دیومالائی افسانوی پیکر دے دیا گیا ہو۔۔۔۔ اور۔۔۔۔"سب سے زیادہ بلند وبالا علمی امر" انہی تفاسیر سے ہم نے یہ بھی سیکھا ہے کہ قرآن کی عربی زبان کو سمجھنے کے لیے زبان کی لغات دیکھنے کی بالکل ضرورت نہیں!!! یاللعجب!

اس فرسودہ تھیوری کا سیدھا مطلب یہی لیا جا سکتا ہے کہ ہمیں اپنے ذہنِ رسا اور علم وحکمت میں جاری ترقی کے دروازے خود پر بند کر لینے چاہیئں، آزاد تحقیق کا نام بھی نہ لینا چاہیئے، اور اُسی قدیمی اور فرسودہ اندھی تقلید کا مسلک اختیار کر لینا چاہیئے جو آج تک ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ تراجم کرنے کے لیے قدیم وجدید تفاسیر کا فراہم کردہ مواد ہی ہمارے لیے کافی وشافی ہے جس سے انحراف کرنا گناہ ہے!!!

قارئین اللہ کے کلام میں دی گئی درج ذیل آیات پر غور کر سکتے ہیں اور پھر خود اپنے ضمیر کی آواز پر بآسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا یہ امر کسی طور پر بھی حلال، جائز اور صائب ہے کہ باری تعالیٰ کی ما قبل سے ہی تشریح وتفصیل کردہ کتاب کو مزید کھول کر بیان کیا جائے۔

اگر آپ اس ناچیز کی رائے پوچھیں،،، تو بغیر کسی شک وشبہ یا ہچکچاہٹ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک قبیح عمل ہے۔ توہینِ مقام الٰہی کے مرتکبین ہی ایسی جسارت کر سکتے ہیں، خاص طور پر جب اس کے بارے میں ذیل کی واضح اور حتمی ہدایات آ چکی ہوں۔ بڑے بڑے نام اس جسارت کے مرتکبین میں شامل ہیں۔ نام لینا حدِ ادب سے متجاوز ہو گا۔ (اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے) :-

16/89: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ

اور ہم نے تجھ پر نازل کی ہے وہ کتاب جو " واضح طور پر ہر چیز کو بیان" کر دیتی ہے۔ نیز یہ ایک ضابطہِ کردار ہے اور اسکو تسلیم کرنے والوں کے لیے یہ ایک خوشخبری کا درجہ رکھتی ہے۔

6/97: قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ

ہم نے اپنی تمام آیات کو " تفصیل کے ساتھ بیان" کر دیا ہے، ان لوگوں کے لیے جو تحصیلِ علم سے لگاؤ رکھتے ہیں۔

25/33: وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا

اور لوگ تمہارے پاس اس کی مثل نہیں لا سکیں گے جو ہم نے تمہیں "ادراکِ حقیقت کے ساتھ" اور " خوبصورت ترین تفسیر کے ساتھ" عطا کر دیا ہے۔

12/17: وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا

اور ہم نے اس میں ہر چیز کو " تفصیلی انداز میں کھول کر فیصلہ کن طریق سے " بیان کر دیا ہے۔

114/6: أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا

کیا میں اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو اختیار و اقتدار کا مالک مان لوں جب کہ وہی تو وہ ذاتِ پاک ہے جس نے تمہاری جانب ایک " تفصیل شدہ فیصلہ کن " کتاب نازل کی ہے۔

متعدد دیگر آیات موجود ہیں جن میں یہ واضح تنبیہ موجود ہے کہ اللہ کے اس کلام میں جو ما قبل سے ہی نہایت خوبصورت (احسن) انداز میں واضح کر دیا گیا ہے، انسان کا کوئی کام نہیں کہ مداخلت کرے اور اس میں اپنے الفاظ و خیالات کی ملاوٹ کرے۔ صرف غور و فکر، تدبر و تفقہ اور تحقیق کے ذریعے اس کے حقیقی معانی (اپنی زبان میں) اخذ کرنے کی ترغیب و ہدایت دی گئی ہے،،،، جس کا واحد ذریعہ عربی زبان کی مستند لغات ہیں، کیونکہ یہی وہ ماخذات ہیں جو معانی کی پوری وسعت (range) اور اسکوپ (scope) واضح کر سکتے ہیں۔ اور کیونکہ عربی زبان کی وسعت کے باعث اکثر اوقات ایک عربی لفظ کے درست اور مکمل معانی اخذ کرنے کے لیے اس کے دو یا تین یا اس سے بھی زیادہ اردو مرادفات کی بیک وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس کے لیے یہ لغات آپ کو ایسے کئی مرادف الفاظ کا مستند ذخیرہ فراہم کرنے کی سہولت مہیا کر دیتی ہیں۔

فلہذا درج بالا ارشاداتِ عالیہ کی پیروی کرتے ہوئے، یہ ہم سب مسلمانوں کا فرضِ منصبی بنتا ہے کہ ہم بلا تفریق تمام حاضر و موجود قرآنی تفاسیر کی مذمت کریں خواہ وہ علمائے متقدمین کی لکھی ہوئی ہوں یا متاخرین کی۔ ہمیں قرآن کی تفہیم کے لیے اللہ تعالی کے فرمودات ہی کافی ہیں جو ہمیں بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن میں کوئی امر نظر انداز نہیں کیا گیا، قرآن میں ہر خشک و تر لکھ دیا گیا ہے:

38/6: مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ

"الکتاب یعنی قرآن میں ہم نے کوئی بھی امر نظر انداز نہیں کیا"۔

59/6: ولا رطبٍ ولا یابسٍ الا فی کتابٍ مبین

"کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو واضح طور پر لکھ نہیں دیا گیا"۔

اندریں حالات، بنظرِ غائر ہمیں جس امر کی اجازت دی گئی ہے، اور جو ہمیں کرنے کی ضرورت درپیش ہے، وہ صرف اس کو اپنی زبان میں ایک ایسے معیاری ترجمے کے ذریعے منتقل کرنے کی ضرورت ہے جو اللہ تعالیٰ کے الفاظ سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہ ہٹتا ہو، اور جو قرآن کے بلند علمی

اور ادبی اندازِ بیان کا پورا لحاظ رکھتا ہو۔۔ اور اسی طرح نہ صرف اس کے سیاق وسباق بلکہ اس کے بنیادی پیغام اور اس کی روح کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتا ہو۔ خالص تحقیقی کام پر اپنی بنیاد رکھتا ہو، نہ کہ اسلاف کی اندھی تقلید پر۔ مستند عربی لغات کی سند رکھتا ہو کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس ایسے ترجمے کی وثاقت کے لیے کوئی اور قابلِ قبول علمی(academic) سند موجود نہیں۔

یہاں یہ امر بھی واضح کر دیا جائے تو مناسب ہو گا کہ اکثر ہمیں ایک فقرہ سننے کو ملتا ہے کہ " قرآن کو قرآن سے سمجھنا چاہیئے، لغات سے نہیں" ۔ نہایت افسوس کے ساتھ عرض ہے کہ یہ ایک مہمل، مبہم اور لایعنی فقرہ ہے جو کسی روایتی عالم سے سن کر رٹ لیا گیا ہے۔ اس کی معقولیت یا عدم معقولیت پر غور ہی نہیں کیا گیا۔ " قرآن کو قرآن سے سمجھنا چاہیئے"۔۔۔ "لغات سے نہیں" !

قرآن کو قرآن سے سمجھنے سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن کو لغات سے نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ قرآن ہماری زبان میں نہیں۔۔ ہمیں اسے اپنی قومی زبان، اردو میں سمجھنے کے لیے لغات بہر حال درکار ہیں، جن کے بغیر ہم ایک غیر زبان ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی لغات، یا وہ قاعدے چاہیئں جو لغات ہی کی مدد سے مرتب ہوتے ہیں۔۔۔۔ " قرآن کو قرآن سے سمجھنے " سے دراصل مراد یہ ہے کہ قرآن کو کسی دوسرے ماخذ یا ذریعے سے یا کسی بھی دیگر انسانی تحریر کے واسطے سے نہیں سمجھنا چاہیئے۔ پرانے لوگوں کی لکھی تفاسیر اور ان تفاسیر کی رُو سے کیے گئے تراجم سے نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ براہ راست قرآن پر، قرآن کی زبان کی لغات کی مدد سے غور فرما کر اس کا ایک بلاواسطہ اور بے لاگ علمی ترجمہ اخذ کرنا چاہیئے۔

قرآن کو قرآن سے ہی سمجھنے کے لیے لغات کی مدد لینا ایک لازمی امر ہے۔ دورِ حاضر میں علامہ غلام احمد پرویز قرآن کو قرآن سے سمجھنے کے نعرے کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ غور فرمایئے کہ ان کے مفہوم میں تقریباً ہر جگہ آپ کو فُٹ نوٹ میں مستند عربی لغات، مثلاً، راغب اصفہانی، فیروز اللغات، تاج العروس، محیط المحیط، لسان العرب وغیرہ کے حوالے ملیں گے۔ حد تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مفہوم القرآن کی بہتر تفہیم کے لیے بذات خود محنتِ شاقہ کے بعد ایک عدد لغات،،، لغات القرآن،،، ترتیب دی، جس کے لیے تمام تر مدد دیگر مستند عربی لغات سے حاصل کی گئی اور ہر جگہ ان لغات کے حوالے درج کیے گئے۔ غرض یہ کہ قرآن کو قرآن سے عربی زبان کی لغات کی مدد کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ قرآن اردو زبان میں نازل نہیں کیا گیا تھا۔

درجِ بالا حقائق کی روشنی میں ذرا غور فرمایئے کہ اس موقف میں کتنی جان ہے کہ " قرآن کو قرآن سے سمجھو، لغات سے نہیں!"

روایت پرستوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ان کے احوال سے اور ان کے درمیان ایک متشدد نوعیت کی تفریق سے سبھی قارئین بخوبی واقف ہیں۔ لیکن آج تو قرآنی جماعتوں کی حد تک بھی ان تفاسیر نے ایک قیامت مچائی ہوئی ہے۔ اور اس واحد مسلک رکھنے والوں نے بھی اپنا اپنا قبلہ و کعبہ انہی تفاسیر کی بنیاد پر الگ الگ کر لیا ہے۔ ملک کے اندرون و بیرون موجود تمام قرآنی گروپس نے اپنے اپنے لیڈر کی لکھی ہوئی تفسیر کو قرآن پر آخری حرف

ماناہوا ہے جس سے باہر کا کوئی حوالہ یا تذکرہ ان کے ہاں قابلِ قبول نہیں۔ اس کے علاوہ بھی وطنِ عزیز کے ہر مرکزی شہر میں آپ کو ایسے علماء وفضلا آسانی سے مل جائیں گے جو اپنی تفاسیر لکھ چکے ہیں، یا ان پر کام کرنے میں مصروف ہیں۔ اگر ان کی کوئی جماعت موجود ہے تو وہ بھی خود کو اپنی ہی تفسیر تک محدود کر چکی ہے۔ یہ لوگ بھی مجبور ہیں۔ کیونکہ امت کے کسی مسلک میں بھی باہمی اتفاقِ رائے مفقود ہے اس لیے یہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ بس بیکار بیٹھے اپنے اساتذہ کو ہی حرفِ آخر سمجھتے رہیں۔

یہ امر انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ ہمارے منتخب شدہ قرآنی دانشور ایک پلیٹ فارم پر مل کر بیٹھیں اور ایک مجموعی اور انتھک کوشش کے بعد ، تمام حاضر و موجود تفاسیر کو کالعدم قرار دیتے ہوئے، ایک باہمی طور پر متفقہ ایسا کامل اردو ترجمہ سامنے لائیں جو قرآن کی سچی آسمانی اقدار کی حقیقی عکاسی کرے اور بلند انسانی کردار کے اصول، امن، یگانگت، اجتماعیت اور ہمہ گیریت کا نقیب ثابت ہو۔ نیز اس حتمی ترجمے کی بنیاد پر از سرِ نو قرآن کے انگلش اور دیگر زبانوں میں تراجم کر کے انہیں دنیا میں ہر خاص و عام کے تجزیے اور فیض رسانی کے مقصد کے ساتھ وسیع پیمانے پر پھیلا دیا جائے۔

قرآن کے موجودہ مغربی زبانوں میں کیے گئے تراجم کی ایک بڑی تعداد دنیا کے طول و عرض میں موجود ہے جو تفاسیر ہی کے زیرِ اثر کیے گئے ہیں۔ جو غیر قوموں کو صرف اور صرف ہمارے دین و قرآن کی ایک بگڑی ہوئی شکل بہم پہنچاتی ہے۔ وہی شکل جس پر چلتے ہوئے آج مسلمانوں میں طالبان، بوکو حرام اور داعش جیسی انسانیت کی قاتل تنظیمیں وجود میں آتی ہیں اور ممتاز قادری جیسے سفاک قاتل ہماری قوم کے ہیروز کا درجہ پاتے ہیں ۔ جن کے ذریعے ہمیں سیرت و کردار کا ضابطہ نہیں بلکہ کھانے پینے میں حرام و حلال کی لسٹیں دی جاتی ہیں اور یتیم بچوں کے مسائل حل کرنے کے لیے اُن بے بس بچوں میں سے صرف لڑکیاں چُن کر ان کے ساتھ چار چار شادیاں کر لینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ وہی شکل جس میں ہمارے نبیِ کریم کے بہت سے گھر (بیوت) بتائے جاتے ہیں اور ان میں رکھی گئی ان کی بہت سی بیویاں (ازواج النبی)۔ قرآن میں "مشتبہ" یا "متشابہہ" آیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور فرشتے آسمان سے اُتر کر انسانوں کی جانیں قبض کرتے ہیں۔ نبیوں کو سانپ کاٹ لیتا ہے اور خوفناک بیماریاں انہیں گھیر لیتی ہیں۔ نبیوں کو مچھلیاں بھی نگل لیتی ہیں اور پھر دوبارہ زندہ اُگل دیتی ہیں۔ ان میں سے کسی کو اپنا حقیقی فرزند ذبح کر کے اللہ کے حضور انسانی خون کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے، وہ بھی خواب میں۔ نبیوں ہی سے دالیں، لہسن، پیاز وغیرہ کھانے کے لیے مانگا جاتا ہے اور نبیوں کو ننانوے کے عدد تک بیویاں بھی رکھنے کی اجازت ہوتی ہے، اور وہ ایک ہی رات میں ان سب سے مقاربت بھی کرتے ہیں۔ پہاڑوں سے مقدس اونٹنیاں نکل آتی ہیں اور گنہگاروں کے خاتمے کے لیے ایسے طوفان آتے ہیں کہ دنیا سے تمام ذی حیات مخلوق یکبارگی نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ نبی جنات اور ہواؤں پر حکومت کرتے اور چرند و پرند سے باتیں کرتے ہیں۔ اور عورتوں کو برہنہ دیکھ کر ان پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔۔۔۔

ہمیں درپیش آخری سوال یہی ہے کہ ملاوٹی تفاسیر کی بنیاد پر کیے گئے ایسے تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر کوئی دینِ اسلام کو قبول کر کے اپنا طرزِ زندگی تبدیل بھی کرتا ہے، تو وہ کیسے ایک سچا اور صراطِ مستقیم پر چلنے والا مسلمان بن سکتا ہے؟

آخر میں قرآنِ حکیم کے موجودہ حالت میں ہی مفصل اور کافی وشافی ہونے کے حق میں، اور کسی بھی تفسیر و تشریح کی ضرورت سے مبرا ہونے کے ثبوت کے لیے، کچھ مزید ارشاداتِ ربانی پیشِ خدمت ہیں:-

11/1: كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ

"ایک ایسی کتاب جس کی آیات فیصلہ کُن اور دانائی کی حامل بنائی گئی ہیں اور پھر اس دانشور اور باخبر ہستی کی جانب سے تفصیل سے بیان بھی کر دی گئی ہیں"۔

17/89: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ

"اور ہم انسانوں کے سمجھنے کے لیے اس قرآن کو تمام مثالوں اور تشبیہات کا استعمال کرتے ہوئے متعدد طریقوں میں بیان (صرف) کر دیا ہے"۔

29/51: أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ

"تو کیا پھر ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر وہ کتاب نازل کر دی ہے جو انہیں پیروی کے لیے پڑھ کر سنادی جاتی ہے"۔

عزیز قارئین، تفسیر نویسی اس امّتِ مرحومہ کو لاحق اُن بڑی بیماریوں میں سے ایک ہے جن کے تباہ کن اثرات کے باعث ہماری اجتماعی عقل و دانش، فکر و بصیرت، تحقیق و تفتیش اور آزادی و خود مختاری گذر اوقات کے چند ٹکوں کے عوض جنسِ کوچہ و بازار بن چکی ہے۔ خلافتِ راشدہ کے مابعد کے 1400 سالوں کے عہدِ حکمرانی پر غور کریں۔ اقتدار کے جاہ و حشم کی رنگین کہانیوں کے پیچھے چھپی ہوئی دین اللہ کی بیخ کنی کی ایک طویل عبرت ناک داستان ہے جو حقیقی اسلام کی شکست کا نوحہ پڑھتی نظر آئیگی۔ خلقِ خدا کی رسوائیوں اور جگ ہنسائیوں کی ایک بے توقیر راہ ہے جس پر چلتے ہوئے ہمارے دل و دماغ پر مہر لگ چکی ہے۔ آج قدرت نے ہم پر عزت و تکریم کا ہر راستہ بند کر دیا ہے۔ ہم تہذیب کے قرینوں سے کوسوں دور جا چکے ہیں۔ "چوں کفر از کعبہ برخیزد۔۔۔۔ کجاماند مسلمانی"۔ فکر کے اس ظالم انجماد کے باعث ہمارے علم و ادب و تحقیق کے فورم ایسے "طفلانِ کوچہ و بازار" سے بھرے پڑے ہیں جو ایسی تمام کاوشوں کو گالیاں دینے، طعن و تشنیع کرنے اور فتویٰ بازی کا شوق پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دشنام طرازی کی حدوں کو چھوتی ہوئی تلخ نوائی سے بازاری اشارہ بازی تک سارے حربے نہایت آزادی اور بے ضمیری کے ساتھ آزمائے جاتے ہیں۔

وہ وقت اب آ چکا ہے کہ ہم سب مل کر، اصلاحِ احوال کے ایک عزمِ راسخ کے ساتھ، ایک ایسی عملی جد وجہد کا حصہ بن جائیں جو ایک نئے عہد کا دیباچہ ہو، تبدیلی کا استعارہ ہو اور ایک انقلابِ عظیم کی علامت بن جائے۔ جس کے نتیجے میں وہ سہانی صبح جلد نمودار ہو جائے جب ہماری دنیا کے کسی ایک خطے میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ایک بار پھر عمل میں آجائے اور جدید ترین الیکٹرونک ابلاغیات کے ذریعے قرآنِ حکیم کی حقیقی روشنی اس بابرکت مقام سے پھوٹ کر چار وانگِ عالم میں پھیل جائے۔ قرآن میں تحریف کا راستہ بزورِ طاقت بند کر دیا جائے اور تفاسیر کے پہاڑوں سے بھی بلند گمراہ کُن اور ناقابلِ مطالعہ ڈھیر ہمیشہ کے لیے گمنامی کے تحت الثریٰ میں دھکیل دیے جائیں۔

تمام مسالک سے تعلق رکھنے والے ہمارے روشن خیال عالم و فاضل بھائیوں کو اس انتہائی حساس موضوع پر خالص اور باسند علمی تبصروں کی دعوت دی جاتی ہے جو قرآن کی اساس پر مبنی ہوں۔

حصہ دوم: تفسیر نویسی کی لایعنیت

The Absurdity of Tafseer Writing

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

صدیوں سے قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھی جا رہی ہے، مگر امت کا فکری، معاشی، سیاسی اور عمرانی زوال مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ ابتدا میں ہی خلافت علٰی منہاجِ نبوت جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا خلافت علٰی منہاجِ ملوکیت میں بدل دی گئی اور اس کا مرکز دمشق قرار پایا۔ جلد ہی خاندان بنو امیہ کو مکافات عمل کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی حکومت کی جڑ بنیاد اکھیڑ ڈالی گئی۔ بعد ازاں سلطنتِ عباسیہ عیاشی اور نااہلی کا شکار ہو کر زوال پذیر ہوئی۔ سلطنتِ اندلس جس نے یورپ کے تاریک دور میں علم کے چراغ روشن کیے، نسلی تعصب کی بنیاد پر واقع ہونے والی ریشہ دوانیوں کی نذر ہو کر تباہ ہو گئی۔ اگلے مرحلے میں سلطنتِ مغلیہ برطانیہ کے ہاتھوں ختم کی گئی اور بالآخر تین براعظموں میں پھیلی خلافتِ عثمانیہ اپنی داخلی کمزوریوں کے باعث ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تفاسیر، علم الکلام، احادیث، فقہ اور تصوف کے مختلف مکاتب کی موجودگی اور اشاعت کے باوجود یہ زوال کیوں نہ رک سکا۔ یہاں ہم دیگر موضوعات سے قطع نظر صرف تفسیر پر نظر ڈالتے ہیں کیونکہ تفسیر کی تدوین میں ان دیگر تمام موضوعات سے بھرپور مدد لی جاتی ہے۔

تفسیر کی تاریخ بتاتی ہے کہ مفسرین نے جیسا کہ مولانا محمد اسلم جیراج پوری نے اپنی تاریخ تفسیر میں بتایا ہے، قرآن حکیم کی شرح کے لئے آیت وار تشریح کرنا، قرآن کے ایک حصے کی تشریح کے لئے اس کے دوسرے حصوں سے مدد لینا، قرآنی آیات کے لفظی مفہوم کے لیے ادبِ جاہلیہ کا مطالعہ کرنا، اس کے محاورات کی تدوین اور سورتوں اور آیات کے درمیان ربط تلاش کرنے کی کوشش جیسے اصولوں سے کام لیا اور اصولِ تفسیر کی سائنس کو مرتب کیا۔ احکام کی تفہیم کے لیے قیاس کے اصول کو اپنایا اور اس کی صحت مندی کے لیے استحسان، مصالح مرسلہ اور نظریہ ضرورت کے قوانین کو مدون کیا۔ مگر ان تمام کوششوں سے ملت کے زوال کو روکنے میں ہمیشہ ناکامی ہوتی رہی ہے اور آج بھی یہی صورتِ حال ہے۔

یہ تفاسیر نہ تو قرآن حکیم کے تصورِ کائنات کو اجاگر کر سکیں اور نہ ہی ملت کے لیے جاگیردارانہ معیشت، ملوکیت کے سیاسی نظام اور یونانی عقلیت کی جگہ قرآن کی عوامی معیشت، شورائی سیاست اور علم بالقلم یعنی تحقیق کے استقرائی منہاج کو ترویج دے سکیں جس کی اساس مشاہدہ و تجربہ پر مبنی ہوتی ہے اور جسے آج کی زبان میں سائنس کہا جاتا ہے۔

اسی طرح علم الکلام میں بحث ومباحثے کے لیے تجریدی اور مابعد الطبیعاتی موضوعات کو چن لیا گیا، جیسے وجودِ باری تعالی، اس کی وحدت و یکتائی، صفاتِ باری تعالی، حادث و قدیم، مخلوق وغیر مخلوق، حیات بعد از موت، اعمال انسانی کے نتائج، انسانی فطرت میں کسی دائمی نورانی عنصر کی موجودگی۔ مگر ان کے عمرانی[social] اور نفسیاتی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تفاسیر ملت کی عمرانی زندگی میں کوئی قابلِ قدر تبدیلی نہ پیدا کر سکیں۔

ملت اس تفسیری مواد کے باوجود جاگیر داری معیشت، ملوکیت کی استحصالی سیاست، اور یونان کی غیر تجربی عقلیت کی دلدل میں پھنسی رہی۔ یہاں تک کہ یورپ کی بیداری نے فلسفہ، نفسیات، معیشت، سیاست اور منہاجِ تحقیق میں نئے افق، نئے زاویے اور نئے نقطہ ہائے نظر کو اجاگر کیا اور ملت اسلامیہ بحیثیت مجموعی اپنی فکری، معاشی اور عمرانی پسماندگی کے سبب مغربی اقوام کی غلامی میں آتی چلی گئی۔

مغربی ذہن نے تحقیق کے استقرائی منہاج کے ذریعے، جسے قرآن نے "علم بالقلم" کہہ کر پکارا ہے، کرہ ارض کے کونے کونے کو، سمندروں کی گہرائیوں اور فضا کی لامتناہیوں کو کھنگال ڈالا،، اور آج پیداوار، مواصلات، حمل و نقل، ابلاغ اور اشاعتِ علم کے ذرائع میں بے پناہ وسعت نے دنیا کو ایک خاندان یا گلوبل ولیج[Global Village] میں تبدیل کر دیا ہے۔

مشینی صنعت کے پیدا کردہ سرمایہ داری نظامِ معیشت کے باعث جب محنت کشوں کی زندگی اجیرن ہو گئی اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اقوام نو آبادیاتی نظام کے زیرِ اثر آ گئیں تو جرمن ذہن نے کارل مارکس کو پیدا کیا جس کی تحقیقات نے بتایا کہ مغرب کی ساری ترقی، اس کی دولت اور رفاہیت بالغہ کا سبب محنت کشوں کی محنت کی اجرت کا وہ حصہ ہے جسے ادا نہیں کیا گیا۔ اس نااداشدہ[unpaid] اجرت کو "قدرِ زائد" کی اصطلاح دی گئی ہے۔ لہذا انسانی تاریخ کی ساری جنگیں، فسادات، ساری فتوحات، جنسی ابتذال، عورت کی تذلیل، غلامی، زرعی غلامی اور اجرتی غلامی کے اداروں کا قیام، سب ذرائع پیداوار پر چند افراد کی نجی ملکیت کا نتیجہ ہیں۔

مارکس کے اس عمرانی فلسفہ نے محنت کش کو ایسا نظریہ حیات و کائنات عطا کیا جس کی مدد سے اس نے تاریخ کے پہلے اشتراکی انقلاب کو کامیاب کر دیا اور نسل، قومیت، وطن، رنگ، زبان اور مذہب کی تفریق کے باوجود محنت کشوں میں وحدت کے امکان کو اجاگر کر کے وحدتِ انسانیت اور عالمگیر کلچر کی تشکیل کو معروضی حقیقت بننے کی امید پیدا کر دی۔ اس سوشلسٹ انقلاب نے مسلم اور غیر مسلم محکوم قوموں کو اپنی آزادی حاصل کرنے کا نہ صرف حوصلہ دیا بلکہ اشتراکی انقلاب نے ان کی نظریاتی اور مادی ذرائع سے مدد بھی کی۔

اس سارے عرصے میں مسلم اقوام کی مغرب سے اپنی سیاسی، معاشی اور ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور نئے عہد کے نئے تقاضوں کے پیدا کردہ مسائل کا اسلامی نقطۂ نظر سے حل تلاش کرنے میں یہ تفسیری مواد کوئی مدد نہ کر سکا۔ اپنی نجات اور ترقی کے لیے مسلم اقوام انقلابِ

فرانس اور مغرب کی علمی ترقی، صنعتی سرمایہ داری نظام، بورژوائی جمہوری ادارہ اور مارکسزم سے وجدان حاصل کرتی رہی ہیں اور آج تک حاصل کر رہی ہیں۔ جب کہ ہمارے دینی ادارے تقلید جامد، رجعت پسند فکر اور شدید ماضی پرستی کی کہر میں بدستور کھوئے ہوئے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ قرآن حکیم کی تفہیم کے لیے تمام قدیمی تفسیری مواد کو کالعدم قرار دیتے ہوئے، قرآن کو بحیثیت کل مطالعہ کر کے اس کے اپنی زبان میں **خالص تراجم** کے لیے نئے اصول وضع کیے جائیں اور نیا نقطۂ نظر پیش کیا جائے۔ اس نئے اصولوں اور نئے نقطۂ نظر کی مدد سے قرآن کے اُس بنیادی اور مرکزی نصب العین اور اُس مطلوب مقصدیت تک پہنچا جائے جس کے سبب عہدِ نبوت میں ایمان لانے والوں میں پہلے عرب اور بعد میں دوسرے معاشروں کو تبدیل کرنے کے لیے ایک بے مثال قوتِ عمل کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔

قرآنِ حکیم کو قدیم روایتی نہج پر سمجھنے کی بجائے جدید خطوط پر مطالعہ قرآن کی کوشش کا آغاز سرسید سے ہوا تھا۔ لیکن یہ رویہ اپنی افادیت کے باوجود اپنی ابتدا میں مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ تھا۔ یہ سلسلہ حضرت علامہ اقبال پر آ کر ختم ہوا۔ اقبال جہاں مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے باخبر تھے وہاں اسلامی تاریخ، قرآنِ حکیم اور مشرقی تہذیب کا غائر مطالعہ بھی رکھتے تھے۔ اس طرح اقبال کی شخصیت مجمع البحرین کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اسی سبب انہیں دونوں تہذیبوں کے تقابل کا موقع ملا جس سے وہ اس حقیقت سے مطلع ہوئے کہ قرآنی حکمت ہی عہدِ حاضر میں انسان کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے۔ ڈاکٹر نکلسن کو اپنی اسلام پسندی کی وجہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ "میں ایک ایسے عمرانی نظام کی تلاش میں تھا جس کی اساس رنگ، نسل، قومیت اور مذہب وغیرہ کی بجائے وحدتِ انسانی پر ہو۔ ایسا عمرانی نظام مجھے اسلام میں ملا ہے"۔

اس آگہی نے مغرب کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ کا خاتمہ کر دیا اور قرآنی حکمت کی روشنی نے مغربی تہذیب پر بڑی جارحانہ تنقید کرنے کی ان میں جرات اور حوصلہ پیدا کر دیا۔ اقبال کے بعد جن مسلم سکالرز کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کا رویہ بھی معذرت خواہانہ کی بجائے مغربی تہذیب کے صحت مند اور تعمیری پہلوؤں کو اخذ کرنے کے ساتھ اس کے غیر انسانی اور مخرب الاخلاق رویوں کو مسترد کرنے کی جرات کا حامل ہے۔

قرآنِ حکیم کو نئے نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے والے اصحابِ دانش و فکر کے مکاتبِ فکر کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو ذرائع پیداوار کو انفرادی اور نجی ملکیت سے نکال کر اجتماعی ملکیت میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتے، بلکہ مالدار طبقے کو ترغیب و تربیت اور حکومتی ضوابط کے ذریعے بڑے اکتنازِ دولت [الربا] سے روک کر ایک فلاحی مملکت کا قیام چاہتے ہیں، جو ہر فرد کو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی مکلف ہو۔

دوسری قسم ان اصحابِ فکر پر مشتمل ہے جو ذرائع پیداوار پر اجتماعی ملکیت کو ملتِ اسلامیہ اور ساری انسانیت کی فلاح کے لیے لازمی سمجھتے ہیں تاکہ ایک عالمگیر روحانی اشتراکی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ دانشوروں کا یہ طبقہ مانتا ہے کہ ایسے ہی معاشرے کو اقبال نے روحانی جمہوریت یا مرغدینی سوسائٹی یا محکماتِ عالمِ قرآنی کہا ہے۔ مارکس نے لاطبقاتی معاشرہ کہا ہے۔ قرآن نے جنتی معاشرہ اور حضرت مسیح نے خدا کی بادشاہت سے موسوم کیا ہے۔ ان مسلم اصحابِ فکر و دانش میں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر اجمل خان، ڈاکٹر فضل الرحمان،

ڈاکٹر رشید جالندھری، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر یوسف گورایہ، ڈاکٹر علی شریعتی [ایران]، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، اور جناب غلام احمد پرویز شامل ہیں۔

مکی جدوجہد کی تاریخ کا ترتیب وار مطالعہ، سیرتِ طیبہ کے روایت سازی سے پاک اور مستند مواد پر گہری نظر، اور طبقاتی نقطۂ نظر سے قرآن کا مطالعہ اور ان سب کی روشنی میں ایک بالضبط ترجمے کی اجتماعی کوشش، قرآن کی بنیادی تعلیمات اور نصب العینوں تک پہنچنے کا اب ایک واحد درست ذریعہ ہے۔ اور یہی ذریعہ عہدِ حاضر میں تفہیمِ قرآن کے لیے ایک ضروری منہاج کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دوسرے نقطہ ہائے نظر سے آج تک قرآن سمجھا نہیں جاسکا۔ اور اسی سبب سے کوئی انقلابی قدم نہیں اُٹھایا جاسکا۔ ہمارے سامنے موجود محض ظواہر پرستی، گناہ و ثواب کا ایک طویل اور مبہم فقہی ضابطہ، اور مطلب پرستانہ انداز میں تعبیر شدہ قرآنی سزاوں کی اساس پر نہ کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ ہی آئندہ آنے کی امید ہے۔ ہر کوشش آج تک ناکام رہی ہے۔ ہمارا ہمالیہ کی چوٹی سے بھی بلند تفسیری مواد تو اس سلسلے میں بالکل لاچار ہے کیونکہ تفسیر نویسی ملوکیت کی استحصالی سیاست کی ایک چال تھی جو انتہائی مذموم خواہش پرستانہ مقاصد رکھتی تھی۔ اور جس کی بعد ازاں، ایک خیرِ کبیر کے مغالطے میں، ہر دور میں اور ہر نسل [generation] کے ہاتھوں، آج تک جلد پر جلد لکھی جاتی رہی ہے۔ جو قوم میں کوئی قوت عمل پھونکنے کی بجائے بے کار پڑی ہے۔

مکی جدوجہد کی تاریخ کے مطابق قرآن کے مطالعے کی اہمیت یہ ہے کہ قرآن کے مخاطب مکہ کے غلام ساز مالدار سردار تھے جن کی سرپرستی میں ایک انتہائی استحصالی، ظالمانہ اور طبقاتی معاشرہ قائم تھا۔ اگر اس اولین جدوجہد کے تناظر کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو ملتِ اسلامیہ میں نہ تو غلامی کا ادارہ دوام حاصل کرتا، نہ ہی جاگیرداری اور ملوکیت کے معاشی اور سیاسی نظام قائم ہوتے، اور نہ ہی یونان کی غیر تجربی اور قیاسی عقلیت کو اپنانے کی ضرورت پڑتی۔ کیونکہ پہلی وحی میں ہی "علم بالقلم"، یعنی وہ علم جو تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے، کی نوید آچکی تھی۔ بلکہ وحی الٰہی، جس کا بنیادی مقصد "کُل انسانیت کی منفعت" ہے، کی روشنی میں معاشی مساوات، عوامی جمہوریت اور استقرائی عقلیت کا قیام عمل میں آچکا ہوتا۔ اسی سبب سے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ملوکیت کے باعث اسلام کا معاشی نظام عمل میں نہیں آسکا، اور اس طرح پسماندہ طبقات اسلام کی برکات سے محروم رہے۔ اور انہیں اپنی بیداری اور کامیابی کے لیے کئی صدیوں تک کارل مارکس کی عمرانی تحقیقات کا انتظار کرنا پڑا۔

اسلام کیونکہ آخری مذہب تھا اس لیے قرآن کی معاشی، سیاسی، عائلی، کائناتی اور ثقافتی ہدایات تمام اقوامِ عالم کے لیے تھیں۔ عرب کا خطہ تو محض ایک تجربہ گاہ کی یا ایک بہترین عملی ماڈل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر بنو امیہ نے مدینہ کی شورائی خلافت کی جگہ موروثی مطلق العنان ملوکیت قائم کر کے انسانیت کو اسلام کی برکات سے محروم کر دیا۔ انہوں نے یہ ظلم بھی کیا کہ مذہبی پیشوائیت کو اپنے ہم قوموں میں اور اپنے مخصوص موروثی وطن میں قائم رکھنے کے لیے عرب کے خطے کو ہی آنے والے تمام زمانوں کے لیے اسلام کا مرکز اور قبلہ و کعبہ قرار دے دیا اور اس کے لیے حج کا ادارہ دوبارہ منظم بنیادوں پر تشکیل دے دیا جو انہی کے بت پرستی کے ایام کی ایک متروکہ بدعت تھی۔

بہر حال مذکورہ اصحابِ فکر و دانش کی محنتِ شاقہ کے باعث قرآن حکیم کی شرح و توضیح سے اس فکری انتشار کو ختم کرنے میں بڑی مدد ملی ہے جو تفسیر نویسی کے جرم کے ذریعے امت کے اذہان میں رائج کروادیا گیا ہے۔ جس سے دنیا کو بدلنے کے لیے نہ تو نصب العین متعین ہو سکا اور نہ ہی اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے انقلابی جدوجہد ہو سکی۔ بلکہ اس کے برعکس امت مفسرین وفقہا کے باہمی اختلافات کے سبب متحارب فرقوں میں بٹ گئی اور انسانی معاشرہ کو تبدیل کرنے کی بجائے یہ فرقے آپس میں الجھنے لگے۔

اسلامی تحریک کی تاریخ وار جدوجہد کے مطابق مطالعے نے اسلام کو مذہب کی بجائے ایک انقلابی تحریک کی حیثیت دے دی ہے، جس کا مقصد انسانی معاشرے سے اُس مراعات یافتہ طبقے کو ختم کر دینا ہے جو نہ صرف اُس عہد کے عرب معاشرے میں بلکہ عہدِ زراعت کے آغاز سے انسانی معاشرہ میں ظلم وفساد اور اخلاقی تباہی کا باعث بنارہا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کارل مارکس نے اپنے دوست فریڈرک اینگلز کے ساتھ خط و کتابت میں اسلام کو محمڈن ریلیجن [Mohammadan Religion] کی بجائے محمڈن ریوولیوشن [Mohammadan Revolution] کا نام دیا ہے۔

قرآن نے سورۃ "والعصر" میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ انسانی تاریخ میں انسانوں کی اکثریت جو عام طور پر غلاموں، زرعی غلاموں اور اجرتی غلاموں پر مشتمل رہی ہے اور آج بھی ہے، ہمیشہ تباہی و خسران میں مبتلا رہی ہے۔ اس تباہی و خسران کی بنیادی وجہ معاشرہِ انسانی کا معاشی طبقات میں منقسم ہو جانا ہے۔ قصہِ آدم میں آدم کا حیاتِ جنت سے حیاتِ ارضی میں ھبوط کا مفہوم طبقاتی تقسیم ہے کیونکہ قرآن نے کہا ہے کہ ھبوط کا سبب یہ ہے کہ "تم اب باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ہو" ۔ بعضکم لبعض عدو"۔ یہ دشمنی طبقاتی کشمکش اور تنازع کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ حکمران اور دولت مند طبقے اپنی سلطنت کی حدود کی توسیع، مال و دولت اور غلاموں کی کثیر تعداد کے حصول کے لیے جنگ و جدل، لُوٹ مار کرتے رہے، اور رزق اور تہذیب و علم کی برکتوں سے محروم کمزور و پسماندہ طبقوں پر ظلم و جبر کرتے رہے ہیں۔ یہ جنگیں اور ظلم و ستم کبھی مذہب، کبھی نسل و قومیت کے تفاخر اور کبھی دشمن کو نیچا دکھانے کے نام پر کبھی کھلے طور پر اور کبھی پس پردہ جاری رکھے جاتے رہے ہیں۔ اس طبقاتی تقسیم کے باعث انسان نے انسان پر اور قوموں نے قوموں پر اس قدر ظلم و ستم، جنگ و جدل اور خونریزی کی ہے کہ ساری تاریخ انہی اعمال سے لہولہان ہے۔

تاریخ کی تمام تہذیبیں جیسے آشوریہ، بابلونیہ، کالڈیہ، سمیریہ، ایرانی، مصری اور رومی تہذیبیں باہمی قتل و غارت گری، جنسی ہوس، استحصالِ محنت اور ہوسِ زر اندوزی کے باعث برباد ہو گئیں۔ ہمارے عہد میں محض کارخانوں میں تیار شدہ اشیاء کو بیچنے کے لیے مغربی اقوام نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی غیر ترقی یافتہ اور کمزور اقوام پر نو آبادیاتی نظام مسلط کر کے انہیں غلام بنالیا۔ ان اقوام کے خام مال کے ذخائر کو بے دردی سے لوٹا اور ان کے افراد کی محنت کا انتہائی سستے داموں خرید کر استحصال کیا تا کہ وہ اپنے کارخانوں کی تیار کردہ اشیاء کے بیچنے کے لیے ان خطوں کو منڈی میں تبدیل کر سکیں اور اس غرض کی تکمیل کے لیے تیسری دنیا کی اقوام کی نسلوں کو مغربی تہذیب میں رنگنے کی کوشش کی۔

آزاد منڈی کی معیشت کے باعث دو خون ریز جنگیں ہو چکی ہیں اور تیسری تباہ کن جنگ کے لیے تیاری کی جارہی ہے۔ منڈیوں پر قبضہ کے لیے یورپی اقوام میں صف بندی آج بھی جاری ہے۔ اس ساری داستان کو صارفیت Consumerism کہتے ہیں۔ دولتمند طبقات کی ہوسِ زر کو پورا کرنے کے لیے دنیا کے مختلف خطوں میں علاقائی متحارب گروہ پیدا کیے جاتے ہیں اور وہاں کی حکومتوں کے مابین مختلف اسباب کی بنا پر باقاعدہ جنگیں کروائی جاتی ہیں تاکہ اسلحہ سازی کے بڑے کارخانوں کی مصنوعات کے لیے صارف پیدا ہوتے رہیں۔ محاذ آرائیاں خود پیدا کروائی جاتی ہیں تاکہ زمانہ امن میں بھی دونوں مخالف ممالک اسلحے کے انبار مغربی طاقتوں سے خرید کر جمع کرتے رہیں۔

لہٰذا اس طبقاتی پیراڈائم کو نظر انداز کرنے سے ہمارا تفسیری ادب اسلام کے معاشی اور سیاسی نظام کو کوئی متعین شکل نہ دے سکا۔ نہ ہی عورت کے معاشرتی مرتبے اور عورت مرد کے تعلقات کو واضح کر سکا۔ نہ ہی یہ بتا سکا کہ کائنات، معاشرہ اور ذہنِ انسانی میں حرکت و تغیر کا عمل جاری ہے یا نہیں۔ اور اگر جاری ہے تو حرکت کی نوعیت دولابی Cyclical ہے یا ترقی پذیر Linear ہے۔ اور نہ ہی یہ بتا سکا کہ معاشرتی حرکت کسی نصب العینی معاشرہ کے قیام کی طرف ارتقا پذیر ہے یا نہیں۔ اس غفلت سے ملوکیت اور غلامی کے ادارے مضبوط ہو گئے اور مسلم تاریخ کے ہر دور میں عوام علم سے بے بہرہ، مفلس اور انتہائی پسماندہ حالت میں رہتے رہے ہیں۔

اس طبقاتی پیراڈائم کے نقطہ نظر سے کوئی ایک بھی تفسیر موجود نہیں ہے۔ وہ مسلم علماء اور سکالر جو طبقاتی نقطہ نظر کی اہمیت کو سمجھتے ہیں انہوں نے بھی اس کی روشنی میں قرآن حکیم کی کوئی مکمل تفسیر نہیں لکھی۔ اس سلسلہ میں جناب غلام احمد پرویز کی کوشش قابلِ قدر ہے۔ مگر ایک تو یہ کوشش محض معاشی مسئلہ تک محدود ہے، دوسرے مسلم معاشرے کی طبقاتی نہج کو تبدیل کرنے کے لیے یہ کوئی سیاسی تحریک پیدا نہیں کر سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم فکر اور معاشرتی تنظیم دونوں میں جمود اور رجعت پسند رجحانات نے جڑ پکڑ رکھی ہے۔ اور مسلم امہ زندگی کی دوڑ میں انتہائی پست درجہ پر مقیم ہے۔ مارکس کے فلسفہِ حیات پر تو ایک عظیم الشان مملکت قائم ہو کر ٹوٹ چکی ہے، مگر دنیا کے دوسرے حصوں میں بعض جگہ اس طبقاتی فلسفے پر ریاستیں قائم ہیں جن میں چین، شمالی کوریا، ویت نام، کیوبا اور نکارا گوا وغیرہ موجود ہیں۔ اور جہاں ریاستیں نہیں وہاں کمیونسٹ پارٹیوں کی تنظیمیں موجود ہیں۔ مگر مذاہبِ عالم میں عموماً اور اسلام میں خصوصاً قرآن یا کتبِ مقدسہ کی اساس پر ایسی کوئی نہ تو تنظیم موجود ہے اور نہ ہی کوئی نظریہ حیات موجود ہے۔ تمام مسلم ممالک میں یا تو ملوکیت قائم ہے یا پھر وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے زیرِ اثر ہیں۔

اس صورتِ حال کو صرف اور صرف طبقاتی پیراڈائم کی روشنی میں اسلام اور قرآن کا مطالعہ اور اس مطالعے سے اخذ ہونے والے نتائج کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک سیاسی جماعت اور سیاسی تحریک کا قیام ہی بدل سکتا ہے۔ اور ایسے ادارے کے قیام کے لیے ابن الوقت اور محنت کا استحصال کرنے والے دھوکے باز سرمایہ داروں کی بجائے خلوصِ نیت اور مشنری جذبے رکھنے والے دانشوروں اور صاحبِ حیثیت افراد کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ قرآن حکیم کا سرسری مطالعہ بھی معاشی طبقات کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے عنوان میں "البقرۃ" اسی معاشرتی تقسیم [Split, divide, discord or dissention that severs society, corrupts religion and separates men] کو کہا گیا ہے اور اس قرآنی حقیقت کو چھپانے کے لیے اس کا ایک انتہائی عامیانہ اور بازاری معنی "گائے۔ Cow" مروج کر دیا گیا۔ کسی بھی مسلم دانشور یا نابغے نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اللہ تعالیٰ کے نہایت بلند و بالا اور شان و شوکت رکھنے والے کلام میں ایک طویل اور اہم ترین باب کا "گائے۔ Cow" جیسے ایک حیوان کے عنوان کے ساتھ آنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟؟؟ اور "البقرۃ" کی اصطلاح کا کوئی دیگر علمی و ادبی معنی بھی موجود ہونا ممکن ہے یا نہیں؟

اسی کی مانند سورۃ النساء میں لفظ "النساء" انسانی حقوق کے لحاظ سے فراموش شدہ کمزور طبقات، یعنی غریب محروم عوام کے لیے استعمال کیا گیا،،، کیونکہ قرآنِ حکیم کا یہ باب اسی کمزور طبقے کے حقوق کی نشاندہی اور اسی کے تحفظ اور بہتری کے احکامات واضح کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا۔ لیکن جسے تبدیل و تحویل کا شکار کر کے "عورت" کے غیر مستند معنی میں راسخ کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ عورت کے لیے المراۃ کا لفظ تو موجود و مستند ہے لیکن اس لفظ کی جمع "النساء" ہے؟۔۔۔ جب کہ قرآن میں عورت کو تو النساء کی درجہ بندی میں صرف اس بناء پر شامل کر لیا گیا ہے کہ اسے بھی ظلم و جبر کے استعمال سے بدترین استحصال کا شکار بناتے ہوئے حقوق سے محروم کمزور طبقات میں شامل کیا جاتا رہا ہے۔

آج اگر ایسی قرآنی اصطلاحات کا درست ادبی اور علمی ترجمہ سامنے لایا جاتا ہے جس کی شہرہ آفاق مستند ترین لغات پشت پناہی کرتی ہیں، اور جو قرآن کے حقیقی طبقاتی تناظر کی مکمل نشاندہی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اس الہامی وثیقے کے اعلیٰ ترین ادبی اسلوب کی تصدیق کرتا ہے، تو ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں سے ۹۰ فیصد لوگ اس کا بطلان کرنے کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح گویا جدید علمی انکشافات سے انکار اور جہالت، قدامت پرستی اور ذہنی فرسودگی پر اصرار کرتے ہیں۔ اگر ہمارا روایتی اور جدید عقلی مفسر قرآن کی اس معاشی اور معاشرتی حقیقت پر مطلع ہو جاتا، یا اس پر جان بوجھ کر دبیز پردے نہ ڈال دیتا، تو کارل مارکس سے کہیں پہلے، طبقاتی پیراڈائم کے انطباق و اطلاق سے، انسانی مسائل، جیسے عمرانی و نفسیاتی علوم سے آگہی، اور قرآن اور دوسری کتبِ مقدسہ کی صحیح تفہیم عمل میں آ گئی ہوتی اور انسانی معاشرہ طبقات کے ارضی دائرہ سے نکل کر لا طبقاتی جنتی معاشرہ کی تکمیل کے قریب آ جاتا۔ مگر مذاہبِ عالم کے دانشوروں اور مذہبی پیشواؤں نے اپنے مفاد کے مدنظر اس معاشی اور عمرانی حقیقتِ ثابتہ کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا اور مترفین و مستکبرین یعنی حکمرانوں اور مالداروں کے تعاون سے اپنی حیات دنیاوی میں آرام و آسائش حاصل کرتے رہے۔ اور آج بھی کر رہے ہیں۔

یہ واضح کر دیا جائے کہ ہمارے جن نہایت قیمتی دانشورانِ ملت کی تحریروں سے متاثر [Inspire] ہو کر تحریرِ ھذا سپردِ قلم کی جا رہی ہے ان میں اکثر اس نظریے کے حامی نظر آتے ہیں کہ قرآن حکیم کی ترتیبِ نزولی کو فراموش کر دینے یا اس میں ایک بڑی تبدیلی کے دخل سے مطالعہ

قرآن کی درست ترتیب کو نقصان پہنچا ہے۔ اور یہ کہ ترتیب نزولی کے مطابق مطالعے کے بغیر قرآن کے مطلوب و مقصود اور نصب العینوں تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا۔ اس سلسلے میں مولانا عبد الکلام آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل خان کی مرتب کی گئی ترتیب پر زور دیا جاتا ہے جو جنابِ پروفیسر صاحب نے امام عبید اللہ سندھی کی ترغیب پر نہایت محنتِ شاقہ کے ساتھ مدون کی تھی۔ یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ پروفیسر محمد اجمل خان کی ترتیبِ نزولی کے بعد، جو اپنی حیثیت میں بڑی سائنٹفک اساس اور جامعیت کی حامل ہے، ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار کی روشنی میں قرآن کی ایسی تفسیر لکھی جا سکے گی جو مسلم معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے مسلم ذہن میں انقلابی جذبات پیدا کر سکے گی۔

واضح ہو کہ ڈاکٹر علی شریعتی نے اس موضوع پر بڑا اہم کام کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر موصوف نے پیرس یونیورسٹی سے تاریخ مذاہبِ عالم اور سوشیالوجی [عمرانیات] میں الگ الگ پی-ایچ-ڈی کیا۔ جس کے نتیجے میں مذہب کی تاریخ میں پہلی دفعہ مذہب کی تاریخ اور اس کی اصطلاحات کے عمرانی پہلو کو نمایاں ہونے میں مدد ملی۔

ہمارے فاضل دانشوران کا موقف یہ تھا کہ اگرچہ مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا عبد الرحیم پوپلزئی، صدر مجلسِ احرار چودھری افضل حق اور مولانا حسرت موہانی جیسے علماء اور دانشوروں نے اس سلسلہ میں قابل قدر کام کیا ہے مگر یہ کام نامکمل ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کے سامنے قرآن حکیم کی ترتیبِ نزولی نہیں تھی۔ قرآنِ حکیم کو اس کی ترتیبِ نزولی سے الگ کر دینے کے باعث قرآن رسول اللہ کے انقلابی عمل سے بھی الگ ہو گیا اور انقلابی عمل سے علیحدہ ہونے کے سبب وہ اپنے انقلابی مقاصد بھی پورے نہ کر سکا۔ جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس جیسا کوئی انقلاب وجود پذیر نہیں ہو سکا جو ملت کے فکر و عمل اور اس کے اداروں کو ملوکیت، جاگیرداری اور ملائیت کے گرداب سے نکال کر نئی زندگی اور نئے فکری افق سے روشناس کر سکتا۔

آگے بڑھنے سے قبل ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ترتیب نزولی کا سوال سیر حاصل طریقے سے حل کر لیا جائے۔ ہمارے دانشورانِ ملت کی نہایت مثبت سوچ اور اس کے تحقیقی نتائج اور ان سے ابھرتی ہوئی نئی علمی روشنی کو پورا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ البتہ مذکورہ نتائج کے ضمن میں جدید ترین جدلیاتی عقلیت کے معیار پر کام کرتے ہوئے یہاں دو تین بہت خاص نقاط ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں جو کچھ اس طرح ہیں۔

اول یہ کہ اُن موقر شخصیات کی سوچ میں موجودہ ترتیبِ قرآن کو رسولِ کریم کی مقرر کردہ ترتیب تسلیم نہیں کیا گیا، اور اسی لیے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ اسے حضرت عثمان کے عہد میں جمع و ترتیب دیے جانے کے باعث یہ بڑی غلطی سرزد ہو گئی کہ اس کاروائی میں ترتیبِ نزولی کا بالکل لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اور اس بڑی سہو کے باعث تفاسیر غلط رُخ اختیار کر گئیں اور قرآن فہمی کی مہم اس کتاب کے مقاصد و نصب العین کو پیشِ نظر نہ رکھ پائی۔۔۔۔۔۔۔ دوم یہ کہ اگر موجودہ ترتیب کو رسولِ کریم ہی کی متعین کردہ مان لیا جائے تو پھر ہمارے ان فاضل دانشوروں کے موقف کے مطابق یہ لازم آجاتا ہے کہ خدانخواستہ حضور رسالتمآب نے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب فرمایا۔ سورتوں اور رکعات کو ترتیب دیتے وقت ان کی ترتیبِ نزولی کا لحاظ

نہ رکھا۔ جس کے باعث بعد ازاں آنے والی تفاسیر کے ذریعے قرآن فہمی کا عمل ادھورا رہ گیا یا اپنی درست لائن سے انحراف کر گیا۔ نعوذ باللہ۔۔۔۔۔ اور سوئم یہ مفروضہ بھی قائم کر لیا گیا کہ اگر قرآن کا مطالعہ ترتیبِ نزولی کے مطابق کیا جاتا تو اس کی تفاسیر دین کی اصل مقصدیت اور نصب العینوں کو سامنے لا چکی ہوتیں اور اسلامی دنیا میں انقلاب آ کر طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ کیا ایسا ممکن تھا؟؟؟۔۔۔۔۔ ہم ایک قرینِ عقل نتیجے تک پہنچنے کے لیے باری باری تینوں ممکنہ صورتِ احوال کا مطالعہ کریں گے۔

پہلا موقف: موجودہ ترتیبِ قرآن رسولِ کریم کی مقرر کردہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ ترتیبِ نزولی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لیے غلط ہے؟؟؟

اب اس بڑے قضیے کو درست ماننے کے لیے ہمیں عہدِ عثمانی میں جمع القرآن کی بڑی کاروائی کو اور اس کے ضمن میں ان تمام احادیث و روایات کو درست ماننا پڑے گا جن کے بیانات کے ذریعے سے قرآن کے اجزاء کا ہڈیوں، پتھروں، کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھا جانا اور ایک انتہائی بکھری ہوئی حالت میں حفاظ کی یادداشت میں پایا جانا ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس سلسلے میں ہماری تواریخ میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے وہ واقعاتی ہونے کی بجائے انہی احادیث و روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور تاریخ میں تحقیق ہمیں لازمی طور پر بیانیوں کے ماخذات [Sources] کی جانچ کی جانب لے جاتی ہے۔ تحقیق سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ تمام تاریخی واقعات جن کا ماخذ روایات ہیں نہایت مشکوک کیفیت رکھتے ہیں۔ یعنی ہمیں یہ مفروضہ مان لینے کی جانب لے جایا جا رہا ہے کہ حضور رسالتمآب نے قرآن جیسے ہمیشہ باقی رہنے والے الہامی وثیقے کی تحفیظ و تنظیم و ترتیب کے لیے اپنی زندگی میں کوئی تحریری انتظام یا اہتمام نہیں کیا تھا۔ اور حفاظ کی یادداشت سے اور ادھر اُدھر کی جزوی تحریروں سے، ایک انتہائی مشکوک اور مبہم طریقے سے، قرآن کی بکھری ہوئی سورتوں کو اکٹھا کرنا پڑا؟؟؟؟۔۔۔۔ اب اگر بادنیٰ تعمق غور کیا جائے تو عقلِ سلیم کی رُو سے ایسا ممکن ہی نہ تھا کہ رسالتمآب اپنے اس اہم ترین فریضے کی ادائیگی میں ذرا بھی تساہل برتتے۔ نیز اگر ہم قرآن کی تحریر و ترتیب کو عہدِ عثمانی کا کارنامہ مان لیں تو اس سلسلے کی ماخذ جس قسم کی غیر منطقی و غیر مستند کہانیاں ہمیں ورثے میں ملی ہیں اُن کے باعث قرآن کی وثاقت اور درستگی کا معیار بھی شدید ابہام و شکوک کی نذر ہو جاتا ہے۔ نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے علاوہ بھی ہمیں قرآن کی ایسی بہت سی آیات کا انکار کرنا پڑتا ہے جہاں قرآن کو اس کے نزول کے اولین مرحلے سے ہی کتاب کہا گیا ہے یعنی ایک نظم کے ساتھ لکھی ہوئی تحریر۔ ظاہر ہے کہ ہم قرآن کی سند کے خلاف نہیں جا سکتے، اس لیے ہمارے موقر دانشوروں کا یہ موقف بوجوہ تسلیم کرنے کے لائق نہیں ہے۔

دوسرا موقف: دوسرا مفروضہ کہ قرآن رسولِ کریم ہی کے ہاتھوں مرتب کردہ تو ہے، لیکن رسولِ کریم نے ترتیبِ نزولی کے مطابق ترتیب قائم نہ رکھ کر اس کے مقاصد اور نصب العینوں کو امت کے لیے ناقابلِ فہم بنا دیا ہے [نعوذ باللہ]؟؟؟

اگر اس نہج پر سوچا جائے تو اس موقف سے تو سیدھا سیدھا توہینِ رسالت کا ارتکاب ہوتا ہے اور رسولِ کریم کے ایک بڑے اور سوچے سمجھے عمل کو ایک غلطی کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ قرآن ہمیشہ سے ہمارے پاس رسولی ترتیب کے مطابق ہی موجود

ہے اور اس ترتیب کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہونے میں بھی کسی شک وشبہ کا امکان موجود نہیں ہے۔ نیز رسولِ کریم نے اپنی الہامی دانش و حکمت سے قرآن کو اُسی نظم میں ترتیب دیا ہے جو حق تعالیٰ کا منشاو مقصود تھا۔ اور جو اس کا ممکنہ طور پر بہترین نظمِ ترتیب [best order] ہو سکتا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ کے مطابق قرآن جوں جوں نازل ہوتا گیا ایک نہایت معزز اور محترم خوش نویسوں کی جماعت اسے تحریر کے احاطہ میں لاتی گئی۔ یہ وحی کی تکمیل کی ابتدا سے ہی اتنا مکمل وثیقہ تھا کہ عہدِ عثمانی سے برسوں قبل عہدِ عمر بن خطاب میں اس کے لاکھوں نسخے کتابت کروا کر مملکتِ اسلامیہ کے طول و عرض میں پھیلا دیے گئے تھے۔ نیز قرآن کا جامع اور محافظ قرآن کے فرمان کے مطابق خود باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ بھلا وہ ذاتِ پاک کیسے اس دائمی قائم رہنے والے انسانی ہدایت پر مبنی الہامی وثیقے کو بد نظمی کا شکار ہونے کی اجازت دے سکتا تھا؟ اور اس کی تجمیع و ترتیب کو ساری دنیا کے شکوک و شبہات کا ہدف بننے کے لیے عہدِ عثمانی تک کیسے موخر کر سکتا تھا؟ اگر بالفرض جمعِ قرآن اور ترتیبِ سُور اور رکوعات عہدِ عثمانی ہی میں انجام پائی تھی تو وہ کون سے مکمل قرآنی نسخہ جات تھے تو عہدِ فاروقی ہی میں مملکت کے طول و عرض میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلا دیے گئے تھے؟

<u>تیسرا موقف: تیسرا مفروضہ کہ اگر قرآن کا مطالعہ ترتیبِ نزولی کے مطابق کیا جاتا تو اس کی تفاسیر دین کی اصل مقصدیت اور نصب العینوں کو سامنے لا چکی ہوتیں اور اسلامی دنیا میں انقلاب آ کر طبقاتی تقسیم کا خاتمہ ہو چکا ہوتا؟؟؟</u>

یہ موقف بھی تاریخ میں تازہ ترین تحقیق اور جدید انکشافات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے اور ایک بڑی خوش فہمی پر مبنی ہے۔ تفسیر نویسی کا فن اپنی اصل میں ہی خلافِ ارشاداتِ قرآنی ہے اس لیے ایسا عمل دین کی اصل حقیقت کو سامنے نہیں لا سکتا۔ یہ علم قرآن کی اُن خاص ہدایات کی نافرمانی میں متعارف کروایا گیا تھا جہاں یہ فیصلہ کن انداز میں کہ دیا گیا تھا کہ یہ کتاب خود ہی احسن تفسیر ہے۔ اور مکمل طور پر خود تشریحی اور خود مکتفی ہے۔ اور اس فرمانِ الٰہی کے علی الرغم، یا اس کی نافرمانی میں، تفسیر نویسی کرنے کا واحد مقصد ارشاداتِ ربانی میں انسانی خیالات و تصورات کی آمیزش کر کے دینِ حق کی پاک و منزہ صورت کو مسخ کرتے ہوئے اسے ایک غیر مربوط، غیر عقلی، دیومالائی کلام کی شکل میں پیش کرنا تھا۔

اس مہم کی پشت پر خلافتِ دمشق کارفرما تھی جو اپنی نوع میں ایک خالص غاصب اور خائن ڈکٹیٹر شپ تھی۔ اور کیونکہ اسلام کے تمام سیاسی اور معاشرتی اصولوں اور قوانین کو غارت کرتی ہوئی اقتدار میں داخل ہوئی تھی اس لیے خود پر لگنے والے الزامات اور اپنے ناجائز قبضے کے عدم جواز سے بچنے کے لیے اسلام کی اصل روح کو بگاڑ دینا اس کا اولین ہدف تھا۔ یہ ہدف دو ذرائع سے پورا کیا گیا۔ کیونکہ عہدِ فاروقی سے سلطنت کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لاتعداد قرآنی نسخوں اور قرآنی تعلیم کے مراکز کو ختم نہیں کروایا جا سکتا تھا اس لیے انہیں علیٰ حالہ چھوڑنا پڑا اور یہ متبادل طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک طرف قرآن کی تفاسیر لکھوا کر ان کو علاقائی گورنروں کے ذریعے تلوار کے زور پر منوایا گیا [دیکھیے ڈان گبسن "قرآنک جیوگرافی" ۔ صفحہ ۲۴۸۔ سنہ ۱۰۷ کے سامنے لکھے مندرجات] اور قرآن کے مقصود و مطلوب کو نظروں سے غائب کر دیا گیا۔ دوسری طرف قرآن کے متوازی ایک اور ماخذِ ہدایت احادیثِ نبوی کے نام پر ایجاد کیا گیا جس کے ذریعے دین میں دنیا جہان کی خرافات ارشاداتِ رسول کے نام پر بھر دی گئیں جن کی

مدد سے ایک عیاش استحصالی اور غاصب حکمران جماعت کو مسلمانوں پر حکمرانی کی سندِ جواز عطا کر دی گئی۔ دین میں ثنویت [Dualism] کا ناپسندیدہ عنصر داخل کر دیا گیا جو وحدت کے بنیادی اصول کے خلاف تھا۔ پس تفسیر نویسی کے فن کی بنیادیں ہی ایک ایسے باطل پر رکھی گئیں کہ قرآن کی ترتیب نزولی سے مطابقت یا عدم مطابقت اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ اس فن کے ایجاد کا مقصد ہی دین الٰہی کی غرض و غایت کو عوام کی نظروں سے اوجھل کر دینا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ معدودے چند دانشورانِ ملت کے سوا، جن کے نام نامی مقالے کی سابقہ سطور میں حوالہ زد کر دیے گئے ہیں، تقلید پرست مسلمانانِ عالم آج تک اس بڑے جرم اور اس کے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے بے خبر ہیں۔

اس علمی بحث اور اس کے نتائج تک پہنچ جانے کے بعد اب ہم اپنے مقالے کے اختتام کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔

پہلے یہاں ایک عدد اعتراض سے نبٹ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک فاضل دوست کی جانب سے کچھ اس پیرایے میں اعتراض کیا گیا کہ تم تو قرآن کے تمام قدیمی چلے آرہے معانی کو مسترد کرتے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینکنا چاہتے ہو۔ لیکن یاد رکھو، ہو سکتا ہے کہ آنے والی نسلیں تمہارے متعارف کردہ معانی کے ساتھ بھی ایسا ہی کریں۔ یہ وہ اعتراض ہے جسے ہم اپنے معاشرے میں موجود کسی بھی جوہرِ قابل کو کوئی بھی نیا کام کرنے سے بالجبر روک دینے کا ایک عمومی رجحان کہہ سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ رجحان صرف ہمارے جیسی مردہ قوموں میں ہی پایا جاتا ہے۔ ایسے اعتراضات کی فلاسفی یہ ہوتی ہے کہ "ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے"۔ یعنی جو ہاتھ پیر مارنا چاہتا ہے تاکہ اُس گردابِ بلا سے باہر نکل آئے جس کی زد میں پوری امت آچکی ہے اور نیچے ہی نیچے اتھاہ گہرائیوں ڈوبتی جا رہی ہے، اس سے کہا جا رہا ہے کہ نہیں، ایسی کوشش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تُو بھی ہمارے ساتھ ہی ڈوب مر۔ تیری یہ جرات کیسے ہوئی کہ بچنے اور بچانے کی تدابیر سوچے یا کرے؟

عرض یہ ہے کہ قرآن پر کیے گئے تمام سابقہ تفسیری کام کو تو ہمارے جدید دور کے دانشورانِ ملت پہلے ہی لاحاصل قرار دے کر مسترد کر چکے ہیں، سُو یہ عاجز کون سا نیا اور قابلِ اعتراض کام کر رہا ہے کہ اس پر اعتراضات کا پٹارہ کھول دیا جائے؟ اور یہ استرداد اس بنا پر کیا گیا ہے کہ اس کام کے ذریعے قرآنی تعلیمات کی حقیقی شکل قطعی سامنے نہیں آسکی کیونکہ اس سے امت میں اب تک قوتِ عمل کا وہ لاوہ نہیں پھوٹ سکا جو امت کے مظلوم "سافلہا" کو "عالیہا" کی جگہ دے سکے۔ یہی وہ انقلاب ہوتا ہے جو الہامی تعلیمات کا لازمی ردعمل ہوا کرتا ہے اور جسے قرآن کے مختلف اسالیب میں سورہ حجر کے ان الفاظ کے طرز پر بیان کیا گیا ہے: فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ﴿٧٤﴾ یعنی بالا دست طبقات کو ذلیل و پست کر دیا جاتا ہے اور زیر دستوں کے ہاتھ میں قیادت آجاتی ہے۔

تو کیا آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ یہی "سٹیٹس کو" Status quo برقرار رہے، کوئی کوشش نہ کی جائے، اور پوری امت خائن اور غاصب حکمرانوں اور دنیا کی بڑی طاقتوں کی یونہی غلام بنی اپنی محرومیوں اور اپنے دکھوں پر آنسو بہاتی گذر جاتی رہے؟

گذارش ہے کہ ہمیں تو اپنے نہایت موقر دانشورانِ ملت کے افکار کی روشنی میں اپنے اس منجمد کر دیے گئے شاستر کو ایک نئی زندگی عطا کرنی ہی ہے اور اس مقصد کے لیے نئے معانی متعارف کرانا ایک لازمی امر اور ہمارا فرضِ منصبی ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ بذاتِ خود اس مہم میں شریک ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے، کیونکہ آپ کو آپ کے اہل و عیال کی روٹی اور مکھن [bread and butter] وافر میسر ہے اور جدید سائنس کا مداح ہونے کی حیثیت سے اس خالص مادی تسکین سے بڑھ کر کسی اعلیٰ مقصد کی جانب آپ کی توجہ اور سوچ جا ہی نہیں سکتی، تو آپ بخوشی اس منجمد شاستر کو پڑھ پڑھ کر اس کی کجیاں، کمزوریاں اور عیوب ہر فورم پر اچھالتے رہیں۔ اور ان کا تقابل سائنسی حقائق سے کر کے مذاق اُڑاتے رہیں۔ اور اصلاحِ احوال کی کوئی صورت پیدا کرنے سے مجرمانہ غفلت برتتے رہیں۔ یہ آپ کا ہی نہیں بلکہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کا موجودہ عمومی اور اجتماعی طرزِ عمل ہے۔ لیکن کسی عاجز نے اگر اس بڑی مہم کا بیڑہ اُٹھایا ہے اور دانشورانِ ملت کے افکار کو ایک مطلوبہ تعمیری و انقلابی شکل عطا کرنے کے لیے محنتِ شاقہ کر رہا ہے تو کم از کم اُس کی راہ میں روڑے تو نہ اٹکائیں۔ عاجز کی اس مہم کے ساتھ آئندہ نسلیں کیا کریں گی یہ بات آپ ابھی نہیں جان سکتے، نہ ہی آپ کی ممدوح و محبوب سائنس اس امر کو دریافت کر سکتی ہے۔ اس لیے قیاسات اور پیشین گوئیوں سے کام لینا بے کار ہو گا۔ انسانی ارتقاء جاری ہے اور اس کے باوصف ہمیں امید ہے کہ ہمارا کیا ہوا کام اگلی نسلوں کو آگے بڑھنے کے لیے ایک مزید ترقی یافتہ پلیٹ فارم ضرور عطا کرے گا۔

اس ضمن میں یہ بھی آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دیا جائے کہ یہ نئے معانی نہ تو زبان دانی کے اصولوں کے خلاف ہیں، نہ ہی خارج از عربی زبان ہیں اور نہ ہی متعلقہ مادوں اور ان کے ذیلی مشتقات اور ترکیبات کو نظر انداز کرتے ہوئے لائے جا رہے ہیں۔ قرآن کے معاملے میں ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ جو بھی کوئی فردِ واحد جیسا چاہے ویسا ترجمہ کر لے، جیسا کہ آپ نے باور کیا، اور اُس کے لیے شرفِ قبولیت بھی حاصل کر سکے۔ ایسی سوچ رکھنے والے احمقوں کی جنت میں تشریف فرما ہیں۔ قرآن حکیم کا ایک ایسا بامعنی ترجمہ کرنا جو قرآنی الفاظ کی روح اور لسانی حدود سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوتا ہو، اور قرآن کا مافی الضمیر بھی واضح اور روشن انداز میں کھول کر بیان کر دے، نہ ہی بچوں کا کوئی کھیل ہے اور نہ بے فکروں کی زبانی درازی کا کوئی کھلا میدان کہ ہر ہما شما معتبر بن کر جیسا چاہے کرتا پھرے۔ اس میدان میں اپنی مرضی اور خواہش کا اطلاق کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایسا کرتے ہی تمام معانی معیار سے گر جاتے ہیں اور مبہم ولایعنی ہو کر فہم سے بالا بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ تمام موجودہ تفاسیر و تراجم خود دیکھ لیجیے۔ یہ وہی ہیں جن میں خواہش پرستانہ کام کیا گیا ہے اور اس لیے آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگ ان میں ہزاروں کیڑے نکال سکتے ہیں، اور نکالتے رہتے ہیں۔ تمام قابل ترین جدید دانشوران ان کے بڑے حصے کو مسترد کر چکے ہیں۔ دُور کیوں جایئے، ہمارے ہی دور میں ایک اچھی ترقی پسند ابتدا رکھنے والے مکتبِ فکر، لاہور کے آستانہ، کے ہاں یہی صورت حال اُس وقت دیکھنے میں آئی جب قرآن کی ترجمانی کا رُخ ایک بڑے تبدل و تحول کی نذر کر دیا گیا اور اسے اپنی خواہش کے تابع کرتے ہوئے ایک مخصوص مادی اور دہریاتی نظریے کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اور پھر اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ حلقہِ درس کی تمام مجموعی فکر اور کاوش استعمال کرنے کے باوجود نئے تراجم کی حالت بقولِ شاعر وہ ہو گئی کہ۔۔۔۔ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"۔ اور الحاد و دہریت کا ٹھپہ بھی لگ گیا۔ پس اس ضمن میں آپ کو فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ "العصر" یعنی زمانے اور وقت کی قسم یونہی نہیں اُٹھاتا۔ وقت اور زمانہ اپنا

ایک حتمی اور قطعی فیصلہ کُن ردِ عمل قوموں اور قبیلوں پر خود صادر کر دیا کرتا ہے۔ جو بھی تراجم خالق ومالک کا مقصود و منشاء پورا کرنے کے ناقابل ہوں گے وہ بلا استثناء از خود تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیے جائیں گے۔

تفسیر نویسی ایک جرم و گناہ ہے کیونکہ یہ تفہیمِ قرآن کا اللہ ورسول کی جانب سے مجوزہ یا منظور شدہ نسخۂ کیمیا نہیں ہے،،، بلکہ یہ طریقۂ تفہیم تو کثرت سے انسانی خیالات و تصورات کی آمیزش کے باعث اللہ کی مقررہ کردہ حدود سے انحراف اور تجاوز کے مترادف ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے جزء اول [**تحقیقِ تفسیر نویسی**} میں بہت سی قرآنی نصوصِ صریحہ کی اسناد و تصدیق کے ساتھ واضح کیا گیا، قرآن کو ہی بزبانِ خود سب سے بہتر تفسیر [احسن تفسیر] قرار دیا جا چکا ہے اور متعدد بار یہ بھی فیصلہ دیا جا چکا ہے کہ کوئی فرد اکیلے یا کوئی جماعت مل کر بھی اس سے بہتر انداز میں بیان کی ہوئی تحریر پیش نہیں کر سکتے۔ فلہٰذا، قرآن فہمی کے لیے عوام الناس صرف اس الہامی وثیقے کے اپنی زبان میں ایک ایسے منضبط ترجمے کے حقدار ہیں جو قرآنی نصوص اور الفاظ و اصطلاحات کے لغوی معانی سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہ ہٹتا ہو۔ اور نہ ہی اس کا علمی و ادبی درجہ پست کرنے کے لیے اس کے نہایت عامیانہ اور بازاری معانی منتخب کرتا ہو۔ صرف اسی ایک طریقے سے قرآنی مقاصد، اہداف اور نصب العین پوری دنیا کے سامنے لائے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ کتاب کے جزء سوم [**قرآن فہمی اور عربی زبان**] میں بیان کیا گیا، صرف عربی زبان کے گرامر کی گردانیں یا عربی شاعری کی باریکیاں سمجھنے میں دس سال صرف کر دینے سے ان مقاصد، اہداف اور نصب العینوں کا شعور اور انہیں عوام الناس کے سامنے لانے میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ گہرا ہمہ جہتی تاریخی اور عمرانی مطالعہ اور وسیع الاطراف علمی تناظر جو انسانی شعور کو ارتقاء کی ایک خاص منزل تک پہنچا سکے، اس مہم کے پیشگی تقاضے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس ضمن میں جو بھی تیار کردہ تراجم ان مقاصد کو بروئے کار لانے میں اب تک ناکام رہے ہیں، یا آئندہ بھی ناکام رہیں، انہیں غیر معیاری قرار دے کر اشاعت کا اہل ہی نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔ اور ایسی کوششیں کرنے والوں کو سخت انتباہ کر کے ایسی اہم مہمات سے باز رہنے کا حکم دیا جانا چاہیئے۔ نیز ایسے تمام مترجمین کو نااہل قرار دے دینا چاہیئے جن کے تراجم غیر موزوں مرادفات کا استعمال کرتے ہوئے وہی فرسودہ تصورات، معجزات و توہمات، پرستش کی مردہ رسومات، بے روح دعائیں و مناجات، تقدیر پرستی، قناعت و صبر کی اُسی طرح تلقین کرتے ہوں جیسے کہ تمام تر موجود تفاسیر کے ذریعے امت کی سوچ میں داخل کیا جا چکا ہے۔ یا جن کے تراجم ایسے مبہم انداز یا ایسی غیر واضح زبان کے حامل ہوں جو اہل علم و شعور کے فہم میں آنے کے قابل ہی نہ ہو۔

تفسیر نویسی کی آڑ میں جس جرم کا ارتکاب کیا گیا اس کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کے معانی کی وسعت اور پھیلاؤ کی حدود میں سے نہایت کرشمہ سازی کے ساتھ وہی مخصوص معانی منتخب کر لیے گئے تھے جو انتہائی عامیانہ، بازاری اور خالص لفظی تھے اور جن کے ذریعے

قرآن کے پیغام کو تبدیل کرتے ہوئے اس کے اصل مقصود و مطلوب کو چھپایا جا سکتا تھا۔ جب کہ معانی کے وسیع پھیلاؤ میں سے وہ کلمات نظر انداز کر دیے گئے جو علمی، ادبی اور گہرے استعاراتی یا محاوراتی معانی فراہم کرتے تھے لیکن قرآن کے مافی الضمیر کو پوری حقانیت کے ساتھ واضح کر دیتے تھے۔ اور اس الہامی وثیقے کے ادبِ عالی کا ایک شاہکار، اور عوامی انقلابِ عظیم کا ایک اعلان، ہونے کی حیثیت بھی برقرار رکھتے تھے۔ قبل ازیں اس مخصوص ارتکابِ جرم کی دو مثالیں سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء کے عنوانات کے لغوی معانی کے حوالے سے وضاحت پیش کرتے ہوئے سپردِ قلم کر دی گئی ہیں جہاں سے اس جرم کی نوعیت کی پوری حدود قاری کے سامنے آ جاتی ہیں۔

مقصدِ تحریر ہمارے انتہائی فاضل دانشورانِ قرآن کے افکار و نظریات کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کی قدر و قیمت کا پورا ادراک کرتے ہوئے اِس مخصوص ریسرچ کو اُس بلند مقام سے تھوڑا اور آگے لے جانا ہے جہاں ہمارے ان روشن خیال مفکرین نے اسے اپنی زندگیوں میں پہنچا دیا تھا اور ہمارے علمی مستقبل کے راستوں کو منور کرنے کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ غاصب ملوکیت کے نام پر انسانیت پر جو قیامت ٹوٹی وہ اس کے نتائج و عواقب خوب جان چکے تھے۔ تفسیر نویسی کی فرومائیت ولایعنیت سے بھی وہ خوب آگاہ تھے۔ اسلامی دنیا میں پھیلے جبر و استبداد کے دور کی پوری طوالت سے وہ رُوشناس تھے اور اشتراکی انقلاب یا انقلابِ فرانس کی طرز کا کوئی انقلاب اسلامی دنیا میں بھی دیکھنے کے لیے ان کے درد مند دل آہ پکار کرتے تھے۔ اگر عہدِ حاضر کی تحقیق و تفتیش ہمارے ان لائق دانشوروں کو دستیاب ہو جاتی اور وہ ملوکیت کی قرآن کو مسخ کرنے کی ہمہ گیر سازش کو بھی بے نقاب کر سکتے جو آج اِس مکتبِ فکر کے ذریعے کر دی گئی ہے، تو یقین کامل ہے کہ ہمارے وہ لائق فائق اساتذہ بھی تفسیر نویسی کی اصل و اساس کو نہ صرف سمجھ چکے ہوتے بلکہ اس اندازِ تحریر کو قرآن کے خلاف مانتے ہوئے ترتیبِ نزولی کے مطابقت میں، یا طبقاتی پیراڈائم کا لحاظ رکھتے ہوئے، تفسیر نویسی کا ایک اور نیا باب کھول دینے کی سفارش ہرگز نہ کرتے۔ بلکہ اس فنِ کتابت کو کالعدم قرار دے چکے ہوتے۔

درحقیقت ہماری تفاسیر میں قرآن کے انقلابی اہداف و مقاصد ترتیب نزولی کو ملحوظِ خاطر نہ رکھنے کے باعث، یا طبقاتی پیراڈائم میں کام نہ کرنے کے باعث، سکالرز کی نظر سے اوجھل نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اِس وجہ سے جان بوجھ کر اوجھل کر دیے گئے تھے کہ تفسیر نویسی کے مذموم فن کی اصل و اساس ہی بنو امیہ کے دربار کی سازش پر قائم تھی۔ اور اس سازش کا بعینہٖ یہی مقصد تھا کہ قرآن کے پیغام کے تمام حقیقی خدوخال نظروں سے اوجھل کر دیے جائیں۔ پس بڑی کامیابی سے کر دیے گئے۔ ترتیبِ نزولی یا ترتیبِ رسولی کے دونوں آپشنز میں سے کوئی بھی اختیار کر لینے سے بنو امیہ کے بھیانک عزائم کی تکمیل کے عمل میں کوئی جوہری فرق نہیں پڑ سکتا تھا،،،،، اور طبقاتی پیراڈائم کا ذرہ برابر بھی اقرار یا اظہار ان کی مستبدانہ پالیسیوں کے صریحا خلاف تھا۔

قرآن خود اپنی بہترین تفسیر ہے۔ رسولِ خدا کی مستند سیرت کا بیان سامنے رکھتے ہوئے [روایات پر مبنی آپ کی ذاتیات کے بارے میں خرافات کو نظر انداز کرتے ہوئے]،،،،، اسلامی تحریک کے ترتیب وار واقعاتی تسلسل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے،،،،، طبقاتی تناظر کی روشنی میں مکہ کے سرداران اور بالعموم یمن سے سیریا تک پھیلی سرزمینِ عرب کے تمام ظالم اور بالادست طبقات اور معاشروں کے غلام ساز اداروں کے خلاف مظلوم

اور زیرِ دست عوام کی کشمکش کا پورا سکوپ مطالعہ کرتے ہوئے،،،،، الہامی صحیفے کا ادبِ عالی کا پسِ منظر اور معیار بر قرار رکھتے ہوئے،،،،، تمام اہلِ عرب و عجم سے مستعار لی ہوئی تفاسیر اور انہی سے متاثر تراجم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے،،،، **نہایت حدود آگاہ، منضبط اور انسانی قابلیت کی معراج کا استعمال کرتے ہوئے،،، ایک روشن اور واضح ترجمہ ہی وہ واحد حل ہے جو قرآن کے مقصود و مطلوب اور نصب العینوں کو سامنے لا کر امت کے طول و عرض میں ایسی قومی تحریکیں پیدا کر سکتا ہے جو عظیم تبدیلیوں کا استعارہ بن جائیں** ۔ اور عوامی انقلابات کے ذریعے اقتدار پر قابض تمام طاغوتی خاندانوں اور ان کے کاسہ لیسوں کو ان کے بلند و بالا مناصب سے اُکھاڑ کر تاریخ کے ان سیلن زدہ تہ خانوں میں پھینک دیا جائے جہاں ایسی بدبودار غلاظتوں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ عاجز انفرادی طور پر ما قبل سے ہی روبہ عمل ہے۔ قرآن کے موضوعاتی عقلی تراجم کی ایک سیریز کا آغاز کر چکا ہے۔ اب تک ۱۳۵ اہم قرآنی موضوعات [Themes] پر جدید اور ترقی یافتہ علوم کی روشنی میں، اور جدید عقلیاتی معیار کے مطابق پیرایہ اظہار استعمال کرتے ہوئے، آسان فہم تراجم پیش کر چکا ہے جو Scribd کے ساتھ ساتھ مقامی ای-لائبریریوں میں اپ لوڈ کیے جا چکے ہیں۔ گلوبل سکالرز ریسرچ کامپلیکس راولپنڈی نے [gsrcomplex@gmail.com] ان تراجم کی اقساط کو ترتیب دے کر پہلی جلد کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ ان موضوعاتی تراجم سے عمومی فیض رسانی کا عمل جاری و ساری ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ انفرادی کوشش موسلا دھار بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو اور قرآنی دوست احباب مل کر اسے اجتماعی شکل دیں اور قرآنی قافلے کو کامیابی کی بڑی منزلیں طے کرانے میں مددگار اور راہنما بن جائیں۔ مختلف قرآنی موضوعات پر واضح اور دوٹوک انداز میں لکھے جانے والے مختصر آرٹیکلز کا سلسلہ بھی جاری ہے جو ایک حتمی انداز میں ہمارے حج، نماز، روزہ، زکاۃ، طلاق، سود وغیرہ جیسے امور کا پسِ منظر اور ان کی معاشرتی حقیقت، اور دیگر الہامی نظریات کی تفہیم عامۃ الناس کے لیے آسان کرتے ہیں اور جن کی ہر گھر اور ہر ادارے میں ضرورت ہے۔ نیز وطنِ عزیز میں موجود مختلف قرآن دشمن عناصر کی جانب سے وقتاً فوقتاً قرآن سے راست ہدایت لینے والوں کی تذلیل، تضحیک اور اُن کے خلاف فتوے بازی کا موثر جواب دے کر ایسے عناصر کو زبان بندی پر مجبور کر دینا بھی آج قرآنی میدان میں صرف اسی عاجز کے ذمہ لگا دیا جانے والا ایک اور بڑا کام ہے۔ اس سلسلے کی بھی بہت سی تحریریں ہماری ای-لائبریریوں میں آپ موجود پائیں گے۔ یہ عاجز ایک قرآنی انقلابی سیاسی تحریک کی تین سال تک اس کے قیام سے لے کر ۱۰۵ شہروں اور قصبوں تک توسیع کے عمل کی سربراہی بھی کر چکا ہے۔ شومئ قسمت کہ یہ تحریک بعد ازاں چند مذموم عناصر کی تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی کی نذر ہو گئی۔

فی الحقیقت قرآنی مقاصد سے آگہی کی اِس بڑی مہم کے عالمی پیمانے پر موثر ہونے کے لیے اسلامی حکومتوں کو ایک علمی اور تحقیقی اتحاد کی فوری ضرورت ہے۔ ایک سمجھوتے کے تحت عالمی درجہ رکھنے والے مسلم دانشوروں کی ایک ایسی ٹیم مختلف اسلامی ممالک سے اکٹھی کی جائے جن کے تعلیمی کوائف اعلیٰ ترین علمی قابلیت کے معیار پر پورے اُترتے ہوں۔ ان سکالرز پر مشتمل ایک عالمی تحقیقی ادارہ قائم کر دیا جائے جو دنیا کی تمام اہم اور وسیع علاقوں میں مستعمل زبانوں میں قرآن کے شایانِ شان، کسی تفسیر کی بجائے، ایک متفقہ معیاری اور انتہائی معروضی ترجمہ منصہِ شہود پر لانے کا

اہتمام کرے۔ اس ادارے کو ایک مشترکہ فنڈ کے ذریعے وہ تمام مالی استطاعت مہیا کی جائے جو ان کی تحقیق میں ہر طرح کے ترقی یافتہ ذرائع کو اختیار کرنے میں کسی رکاوٹ کو مانع نہ ہونے دے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام ایک متفق علیہ اور نہایت اہل ترجمہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے جو جدید ترین عقلیت کے مطابق قرآن کی تمام مختلف الجہات خوبیاں اور اس کے الہامی علم کی باریکیاں جدید علمی اور سائنسی پیرایے میں، فطرت، معاشرے اور انسانی ذات کے تناظر میں، عوام الناس کے سامنے آشکار کر دے۔ یہی ادارہ اس بات کا بھی اختیار رکھتا ہو کہ اس کام پر ٹھوس اور مستند نکتہ چینی وصول کرے اور اس کی روشنی میں اپنے کام میں حک و اضافہ یا ترمیم و تبدیلی کر سکے۔ اس ادارے کا شائع کردہ ترجمہ تمام مسلم ممالک اور غیر مسلم اقوام کے لیے مستند مانے جانے کا حقدار ہو۔ نیز وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے علمی انکشافات کی روشنی میں اگر اس کام کی کچھ جزئیات کو وقتاً فوقتاً اپ ڈیٹ [update] بھی کرنا پڑے تو یہی ادارہ اس کام کا اختیار بھی رکھتا ہو۔ اگر ایسا اتحاد فی الفور ممکن نہ ہو، جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے، تو کم از کم پاکستان میں ہی ایک ایسی حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے جو اس مہم پر کام کرنے پر آمادہ ہو اور ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کے لیے پورا اختیار اور مالی وسائل مہیا کر دے تا کہ کسی نہ کسی پیمانے پر یہ بنیادی کام شروع کر دیا جائے کہ جس پر امت مسلمہ کی بیداریِ نو یا نشاط ثانیہ منحصر ہے۔

محترم قارئین، اس دوسرے مگر اہم ترین جزء کو پیش کرتے ہوئے **تفسیر نویسی کے فنِ کتابت کی لایعنیت [Absurdity]** کے بارے میں یہ مقالہ درجِ بالا الفاظ کے ساتھ ہی مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز مستقبل قریب کے لیے ایک قابلِ اطلاق لائحہ عمل بھی پیش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے، کیونکہ ایک لکھنے والا اگر صرف مسائل کا رونا روتا رہے اور ان کا حل پیش کرنے کے قابل نہ ہو،،،،، جیسا کہ عمومی رجحان فی الوقت نہایت زور و شور سے ہر فورم پر جاری ہے کہ جو جتنی زیادہ چیخ و پکار کرے اور حاضر برائیوں کا ڈھنڈورا پیٹے وہ اُتنا ہی زیادہ مقبول ہے،،،،، تو ایسی تحریر صرف نوحہ اور المیہ ہی مانی جا سکتی ہے۔ اس میں دانش و ارتقاء کا لازمی تعمیری عنصر مفقود پایا جائیگا اور یہ لاحاصلیت [Futility] پر مبنی ہو گی۔ معنی خیز پنجابی زبان میں ایسے لاحاصل عمل کو "پھُوڑی ڈالنا" یا "سیاپا ڈالنا" کہا جاتا ہے۔ نیز حل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس ضمن میں سب سے قبل اپنی ذات سے کوششوں کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اوپر کی سطروں میں خاصی تفصیل سے نشان دہی کر دی گئی ہے، تا کہ "اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت" والا محاورہ سامنے نہ رکھ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی سے امید ہے کہ یہ کاوش تمام ساتھیوں اور قارئینِ کرام کے لیے شرحِ صدر کا باعث ہو گی۔

حصہ سوم: قرآن فہمی اور عربی زبان

ہماری منطقِ قیاسی کی بنیاد پر لکھی گئی تفاسیر کی روشنی میں

فقیہِ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا
قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا

کیا فہمِ قرآن کے لیے عربی زبان وادب میں مہارتِ تامہ لازمی ہے؟

ہمارے اساتذہ کے زمانے تک فہمِ قرآن کے اصولوں میں سے ایک بڑا اصول یہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ عربی زبان بلکہ زمانۂ جاہلیہ کی زبان اور اس کے قدیم شعری ادب کے ذخیرے سے گہرا استفادہ کرنا بہت ضروری امر ہے۔ اور اس کی توثیق میں یہ بھی کہا گیا کہ زمخشری کی مشہور تفسیرِ کشاف کی تدوین میں یہی اصول کارفرما ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس علم سے قرآن کے لغوی مفہوم اور ادبی اسلوب پر کافی روشنی پڑتی ہے اور بہت سے الفاظ اور اصطلاحات کی تفہیم عرب محاورے کے مطابق مرتب کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی تحقیق کی رُو سے ہماری متوارث چلی آرہی تفاسیر میں ہمیں اس طریق کار کے اتباع کی مثالیں بہت کم ہی ملتی ہیں۔ اسی لیے تفسیروں کے ایک بے اندازہ ڈھیر میں سے صرف تفسیرِ کشاف ہی کی واحد مثال کیوں دی جاتی۔ تاہم یہ اصولِ تفہیم اس لحاظ سے بھی ناقص ہے کہ قرآن کا نزول ایک درست تصورِ کائنات اور انسان کو درپیش متنوع معاشرتی مسائل کے حل کے لئے ہوا تھا نہ کہ عربی زبان وبیان میں مہارتِ تامہ کے حصول کے لیے۔ قرآنِ حکیم کا موضوع تو انسانی معاشرہ کی طبقاتی ترکیب اور اس سے منطقی طور پر پیدا ہونے والے نتائج کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا تھا کہ یہ نتائج اللہ کی عام مخلوق کے لیے منفعت بخش ہیں یا کسی مخصوص گروہ کے غلبہ واستیلاء کو مضبوط کرتے ہیں۔ اور یہ نتائج فرد کے تزکیہ نفس کو کہاں تک ارتقاء دینے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قربِ الٰہی کی منزل آسان ہوتی ہے، جو کہ حیاتِ انسانی کا منتہائے مقصود اور غایتِ کبری ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ ہماری تفاسیر میں مروجہ منطقِ قیاسی کی روشنی میں افراد کے اخلاقی کردار کی صحت کے اصولوں کا احاطہ، یا زبان کی گرامر اور اسلوب کا مطالعہ مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے سلسلہ میں کماحقہ روشنی نہیں ڈال سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ اور معنی میں ایک نامیاتی رشتہ ہوتا ہے۔ ادب میں اسے صورت ومعنی کا رشتہ کہا جاتا ہے اور فلسفہ میں جوہر[substance] اور عرض{appearance} کا۔ اس موضوع پر بڑی دقیق بحثیں کی جاچکی ہیں اور یہ آج ایک علیحدہ اور مکمل علمی میدان ہے۔ زبان، اس کی گرامر اور ذخیرۂ الفاظ ہر علم کے معانی کو واضح کرنے کے لیے

کام میں ضرور لائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر زبان کی ساخت، الفاظ کی نشست، اسلوبِ بیان، صنائع وبدائع اور فصاحت وبلاغت وغیرہ کو کسی علم کے جانچنے کا معیار قرار دے دیا جائے،،،، اور اس علم کے موضوع کے مافیہ {content} اور مغز کو نظر انداز کر دیا جائے، یا استخراجی منطق کی بھینٹ چڑھا کر غلط تعبیر کر لیا جائے، تو اس رویہ سے کسی معاشرہ کی ترقی پذیر اور ابھرتی ہوئی حقیقت کی ترجمانی نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس سے صرف کسی مخصوص معاشرہ کی مرتی ہوئی حقیقت کو بیان کیا جاسکتا ہے۔

لہٰذا حُسن، صداقت اور خیر جیسی مقصود اقدار کو معاشرتی حقیقت میں تحویل کرنا اور اس تحویل سے بدلتی ہوئی معاشرتی زندگی کے حقائق کو افراد کے ذہنوں تک پہنچانے کے بڑے مقصد کے لیے "زبان" کو ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یہ بھی عیاں ہے کہ اس تبدیل شدہ معاشرتی شعور کی ترجمانی اور ترسیل کے لیے محقق کو اس کی ماخذ زبان اور اپنی زبان پر دسترس ہونی چاہیئے تاکہ وہ واضح اور روشن الفاظ میں اپنی بات سمجھا سکے۔ اس کے باوجود موضوع کے مقاصد وغایات کو اور اس کے اساسی نظریات اور بنیادی تعلیمات کے درست ادراک کو زبان، اسلوب اور الفاظ کی تراش خراش پر بہر حال فوقیت حاصل رہے گی۔

اس کی ایک مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ مارکسزم کی تعلیمات کو حاصل کرنے کے لیے عام طور پر جرمن زبان پڑھنے اور اس کے گرامر یا ادب میں غواصی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی جو کہ اس نظریے کی ماخذ زبان ہے۔ ہر زبان میں تراجم نے اس ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم نے مارکسی فلسفہ وتعلیمات کی غایات ومقاصد اور انہیں زندہ معاشرتی حقیقت میں تحویل کرنے کے طریقِ کار اور حکمتِ عملی کو اپنی زبان میں سمجھ کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ پس ادراکِ حقیقت میں کامیاب رہے۔ اور اس منشور کو پارٹی جدوجہد کا محور قرار دے کر سیاسی انقلاب لانے کی تگ ودُو کی گئی۔ مگر قرآن حکیم کے مقاصد وغایات کو بیان کرنے اور انہیں حاصل کرنے کے منہاج کی وضاحت کی بجائے عربی زبان کے حصول اور اس کی باریکیوں کو سمجھنے پر سارا زور صرف کر دیا جاتا ہے اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ایک ہزار برس قدیم علوم پر مشتمل درسِ نظامی کو پڑھے بغیر قرآنی تعلیمات کو سمجھنا اور ان کو زندہ معاشرتی حقیقت میں تحویل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ناممکن ہے۔ اس رویہ نے اسلامی فکر وعمل کے دائرہ کو انتہائی تنگ کر دیا ہے۔ بلکہ اسے اپاہج بنا دیا ہے۔

اسی ضمن میں قرآن حکیم کے مقاصد ومہمات اور اساسیات کو سمجھنے اور انہیں معاشرتی سطح پر حاصل کرنے کے لیے جس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ وہ ہے "اعجازِ قرآن" کا مسئلہ۔ "اعجازِ قرآن" کے ثبوت میں عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کو پیش کیا گیا ہے جس کا تعلق محض عرب قوم سے ہے۔ فی الحقیقت غیر عربی اقوام کے لیے قرآن حکیم کا اعجاز کبھی بھی عربی زبان قرار نہیں پا سکتا۔ اور یہ امر یقینی ہے کہ قرآن حکیم عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا بلکہ مختلف النوع زبانیں رکھنے والی تمام انسانیت کے لیے ہے۔ تو پھر کتاب کے اصل منشور کو ایک طرف چھوڑتے ہوئے صرف کوئی بھی زبان،،،،، کیسے اس کتاب کا اعجاز قرار دی جاسکتی ہے؟

خلافتِ راشدہ کی نظریاتی ریاست کی جگہ ملوکیت کی استحصالی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے قرآنِ حکیم کے منشور کے وہ مقاصد وغایات ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے جنہیں انسانیت کے گرد جہالت، افلاس، معاشی ناہمواری، استحصالِ محنت، جنسی تلذذ، توہم پرستی، ذہنی وجسمانی غلامی، عورت کی تذلیل اور زندگی کی بے مقصدیت کی شکل میں لپٹے ہوئے اصر واغلال کو توڑنے کے لیے تلقین کیا گیا تھا۔

دراصل قرآنِ حکیم کا اعجاز عربی زبان نہیں بلکہ اس کے یہی بلند معاشرتی، نفسیاتی، فکری اور کائناتی حقائق تھے، جن سے اس عہد کا یونانی فلسفہ، رواقی عقلیت، ایران وہند کے مذاہب اور رہبانیت کے مسالک سب تہی دامن تھے۔ اور اس تہی دامنی کی وجہ سے وہ دامنِ انسانیت کے چاک رفو کرنے سے قاصر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ قرآنی اعجاز صرف عربی زبان کی فنی باریکیوں کو قرار دے کر کئی صدیوں تک مسلم ذہن کو اس غیر معاشرتی مسئلہ کے حصول میں مشغول کر دیا گیا۔ عربی زبان وادب اور گرامر میں کامل مہارت کو قرآنی فہم کی ایک مشکل الحصول شرط اور ایک قطعی پیشگی اہلیت کا درجہ دے دیا گیا کہ جس میں یدِ طولی حاصل کیے بغیر قرآن فہمی کا تصور ہی باطل تھا۔ دراصل یہ بھی نسلی تفوق پر زور دینے کا ایک ذریعہ تھا۔ اور علمائے یہود کے اتباع میں قرآن فہمی کا میدان ایک محدود طبقۂ عالیہ کی اجارہ داری کے سپرد کر دینا تھا۔

کسی علم پر پورا عبور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اصطلاحات کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لیا جائے۔ جب تک علم کی اس شاخ کی جس کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے، اصطلاحات اور غرض وغایت کو پوری طرح سمجھ نہ لیا جائے، اس کا مطالعہ علمی نہیں کہلا سکتا، کیونکہ اس صورت میں ابہام اور التباسات اپنے سائے ڈالتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اصطلاحات کا قطعی مفہوم سمجھنے کے لیے اس عمل کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے جس عمل کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ ہر علمی اصطلاح مخصوص عمل سے تخلیق پاتی ہے۔ مثلاً معاشیات کی اصطلاح طلب ورسد کو اگر سمجھنا چاہیں تو مارکیٹ میں اس معاشی عمل کا مطالعہ لازمی ہوتا ہے جس میں اشیاء کی طلب ورسد سے معاملہ پڑتا ہے۔ اس اصطلاح کو اس معاشی عمل سے علیحدہ کر کے طوطے کی طرح رٹ لینے سے اس کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں ہوا جا سکتا جس عمل کے تقاضوں اور ضروریات کو متعین کرنے کے لیے یہ وضع ہوئی تھی۔

اسی طرح قرآن حکیم کی اصطلاحات، جیسے کافر، فاسق، مومن، مسلم، صلوۃ، زکوۃ، ازواج، بنات، مومنات، محصنات، مسافحات، بیوت، نکاح، مالکت ایمانکم، وغیرہ کا مفہوم بھی اُس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس عمل کا معروضی مادی حقائق اور بنیادی قرآنی نظریے کی روشنی میں پوری تفصیل سے مطالعہ نہ کیا جائے جس کے تقاضوں اور ضروریات نے ان اصطلاحات کو وضع کرنے میں مدد دی ہے۔

یہ بھی نوٹ کرنے کا نکتہ ہے کہ قرآنی اصطلاحات کا بہت بڑا حصہ مکی جدوجہد میں وضع ہوا جہاں اسلامی تحریک اور اس کے مخالفین کے درمیان شدید تصادم ہو رہا تھا۔ مدینہ کی سوسائٹی میں منافقین کے کیریکٹر کی وجہ سے منافق کی اصطلاح وضع ہوئی۔ اس کے علاوہ سراپا اور باقاعدہ

جنگوں کی وجہ سے تقسیمِ وراثت، نکاح و طلاق کے مسائل، یتامی کی پرورش، قیدیوں کی آمد کی وجہ سے بہت سی اصطلاحات کی تدوین عمل میں آئی۔ اگرچہ یہ تمام اصطلاحات وحی الٰہی کے ذریعہ نازل ہوئیں مگر وحی الٰہی کے نزول کا تقاضا بھی عمل سے ہی ماخوذ تھا۔ یعنی وحی الٰہی معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے نازل ہوتی تھی۔

مفسرین حضرات نے اصطلاحاتِ قرآن کو قرآن کے اساسی منشور سے، ان کے عملی تقاضوں سے، ان کے معاشرتی حوالوں [social perspective] سے، اور تاریخی پسِ منظر سے الگ کر کے صرف ایک روز مرہ کی عامیانہ زبان سے سمجھنے کی کوشش کی جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اصطلاح کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی بجائے اپنا وضع کردہ پست معیار کا حامل مفہوم اس کی تفہیم میں شامل کر دیا۔ یہاں تک خود اپنا مقرر کردہ عربی زبان و ادب کے بلند اسلوب سے استفادے کا اصول تک فراموش کر دیا۔ یہاں سے ہمیں اس بات کا کافی و شافی ثبوت بھی ملتا ہے کہ ملوکیت کی ابتدائی صدیوں سے لکھی جانے والی تمام تفاسیر ایک ما قبل سے متعین شدہ حکومتی ایجنڈے کے تحت مدون کی گئیں۔ اور پھر سرکاری سرپرستی ہی میں یہ سلسلہ دراز ہوتا ہوا پہلے پہل مکمل ارادی طور پر اور بعد ازاں غیر ارادی یا تقلیدی طور پر جاری رہا اور بالآخر کم و بیش اُسی قدیمی شکل و صورت میں دورِ حاضر تک آ پہنچا۔

یوں بھی تفسیر نویسی اپنی اصل میں قرآن کی فہم کا طریقہ نہیں بلکہ اُس کی فلاسفی کو مسخ کرنے کا ایک ملوکیتی حربہ تھا کیونکہ قرآن بقولِ خود ایک تفسیر، تشریح، تفصیل شدہ اور کھول کر بیان کردہ الہامی وثیقہ تھا جس کی کوئی بھی انسانی ذہن خود اُس کی اپنی تحریر سے بہتر انداز میں وضاحت نہیں کر سکتا تھا۔

قرآن کے اس قولِ فیصل کی روشنی میں تفسیر نویسی ایک حدود فراموشی کے جرم کی صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ کیونکہ اس جرم کے ضمن میں بہت بڑے بڑے محترم نام اور ایک ہمالیہ کی چوٹی کے بقدر بلند اور مقدس تفسیری مواد ہمارے سامنے آجاتے ہیں، اس لیے ہم اس ضمن میں تو خاموشی اختیار کیے لیتے ہیں۔ البتہ تفسیر نویسی پر خالص قرآنی نصوص کی روشنی میں ایک مستند تحقیقی مقالہ قارئین کے غور و فکر کے لیے اس کتاب کے حصہ اول میں پیش کر دیا گیا ہے جو خود تصریحی اور خود مکتفی حیثیت رکھتا ہے۔

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

آپ پر سلامتی ہو۔